ملت کا ترجمان
ماہنامہ
جام نور
دہلی
Rs. 50/-
May 2011
ہم نے دیکھا پاکستان
FIRST
THEN
NEXT
LIBYA
1969-2
1,2,3,4 WE
DON'T WANT
MUAMMER
NO MORE!!
RIGHTS for LIBYA
کیا عالم اسلام کا انقلاب اسلام کے حق میں ہے؟
اس انقلاب سے اگر اسلام کے مطلوبہ نظام عدل کو صحیح معنوں میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا تو
اس سے اسلام اور مسلمان دونوں کی شبیہ روشن ہو کر ابھرے گی
ورنہ حالات اور زیادہ خراب ہوں گے
ARY Q.tv کے بین الاقوامی شہرت یافتہ نقیب
صاحبزادہ تسلیم احمد صابری
سے خصوصی گفتگو

نواں دور

۱۰۲/واں جام

مئی ۲۰۱۱ء

جمادی الاولیٰ/جمادی الآخریٰ ۱۴۳۲ھ

بانگ درا

اس کے بعد بعض بھکری سادات سے ملاقات کی جو سکھر اور لھندی میں مقیم تھے- انہوں نے مجھ سے میرا وطن پوچھا تو میں نے کہا: میں جھوسی سے حاضر ہوا- انہوں نے ملاقات کا مقصد دریافت کیا تو میں نے انہیں بتایا کہ مجھے آپ حضرات سے نسب نامے کی کڑیاں دریافت کرنی ہیں- اگرچہ سبھی لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں لیکن قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق رب تبارک وتعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے، اس لیے میں اپنے نسب کی تحقیق کے واسطے حاضر ہوا ہوں، آپ حضرات اللہ اور رسول کو شاہد مان کر جو بات درست ہو مجھے بتائیں، اگر میں واقعی سید ہوں تو اطلاع بخشیں اور اگر سید نہیں ہوں تو اسے بھی بتائیں، کیونکہ حدیث پاک میں صاف آیا ہے: لعنة الله على الداخل النسب ولعنة الله على الخارج النسب نسب میں خلط ملط کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

مخدوم سید معین الحق جھونسوی

منبع الانساب ص:۱۰۶، فیضان مصطفیٰ علی گڑھ

مراسلت وترسیل زر کا پتہ

ملت کا ترجمان جام نور

۴۲۲ مٹیا محل، جامع مسجد دہلی

MILLAT KA TARJAMAN
JAAM-E-NOOR (Monthly)
422, Matia Mahal,
Jama Masjid, Delhi-110 006
Ph.: 011-29945883, 9717220944
E-mail : jnoormonthly@yahoo.com
k_noorani@yahoo.com
Website
www.newagemediacentre.com

نوٹ: آپ کو ملنے والے رسالے کے لفافے پر (پتے کے اوپر) اس شکل میں 3040/Jan-06-Dec.07 آپ کی ممبری فیس کی مدت لکھی ہوئی ہے، براہ کرم رسالہ پڑھنے سے قبل اسے دیکھ لیں، اگر آپ کی ممبری فیس ختم ہو گئی ہو تو اولین فرصت میں تجدید کرا لیں، ورنہ ہم آپ کو رسالہ بھیجنے سے معذور ہوں گے- ادارہ

ڈرافٹ اس نام سے بنوائیں

MILLAT KA TARJAMAN JAAM-E-NOOR

مدیر اعلیٰ	خوشتر نورانی
مدیر	ذیشان احمد مصباحی
سب ایڈیٹر	نورین علی حق
سرکولیشن منیجر	عنایت حسین
اشتہار منیجر	غلام قادر فیضی
تزئین کار	کوثر سمنانی
کمپوزنگ	جام نور کمپیوٹرز
آپریٹر	شمس الدین مصباحی
کاتب	عبد المجید فیضی

فی شمارہ :	15/=
زر سالانہ :	170/=
قیمت پاکستان میں	50/=
بیرون ملک (ہوائی ڈاک)	$ 30 امریکی ڈالر
	£ 20 پونڈ
لائف ممبر شپ (اندرون ملک)	5000/=
لائف ممبر شپ (بیرون ملک)	$ 300 امریکی ڈالر

پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر غلام ربانی نے اسٹار آفسیٹ 2229/A احاطہ جبن بی، مرد گران، لال کنواں، دہلی ۶ سے طبع کرا کر آفس "ماہنامہ ملت کا ترجمان جام نور" ۴۲۲ مٹیا محل جامع مسجد، دہلی ۶ سے شائع کیا

DL(DG)-11/8049/09-11

مشمولات

جام نور اسلامی حدود کے اندر آزادی اظہار کا حامی ہے۔ اہل قلم کی آرا سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں

Press, 2229/A,
Masjid, Delhi-6
shtar Noorani

اداریہ | **اسید الحق محمد عاصم قادری☆**

ہم نے دیکھا پاکستان

ہمارے دوست مولانا اسید الحق اپنی تمام تر نسبی، خاندانی، علمی، فکری اور قلمی حیثیتوں کے ساتھ از اول تا آخر خانقاہی ہیں، جس کی وجہ سے اپنی ہر حیثیت میں خلق خدا کے ساتھ فیاضی، عفو در گزر، مروت، تعاون اور ترحم کے عناصر وافر مقدار میں رکھتے ہیں، مگر اس عموم میں میرا معاملہ استثنائی طور پر خصوصی نوعیت کا حامل ہے، کیوں کہ وہ مجھ سے اپنی اس حیثیت کے علاوہ دوسری تمام حیثیتوں سے پیش آتے ہیں- دنیا کے ہر شعبے میں ذاتی تعلق اور مراسم کی بنیاد پر لوگوں کو خصوصی رعایت مل ہی جاتی ہے، لیکن دنیا کا یہ پہلا ایسا گہرا تعلق ہے جس کی بنیاد پر وہ سلوک بھی ہم سے روا نہیں رکھا جاتا جو عام طور پر ہندوستان میں دلتوں اور دیگر پچھڑی جن جاتیوں کے ساتھ ہوتا ہے- اس "امتیازی سلوک" پر اگر کبھی دبی زبان میں بھی احتجاج بلند کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو جناب ترک معاملات و موالات کی دھمکی دینے میں جس عجلت کا مظاہرہ کرتے ہیں اتنی تیزی تو ہمارے یہاں بعض مسلک بر دوش حضرات اپنوں کو کافر اور گمراہ قرار دینے میں بھی نہیں دکھاتے-

اسید الحق صاحب اپنی تمام علمی، فکری اور خانقاہی سرگرمیوں یہاں تک کہ سفر کرنے اور اس کی جملہ مشکلات و مصارف میں بھی اشتراکی نقطہ نظر کے پر زور حامی ہیں، لیکن سفر کی روداد لکھنے میں عرب حکمرانوں کی طرح آمرانہ موقف رکھتے ہیں- عرصہ ہوا، ایک بار ہم نے ان کی سفرنامہ نگاری کی کھلے دل سے تعریف کر دی تھی، میرے اس بے لوث جرم کا نتیجہ یوں برآمد ہوا کہ انھوں نے سفرنامہ لکھنے کے سارے حقوق بزور اپنے نام کر لیے- اب میری حیثیت ان کے ساتھ سفر کرنے میں تو ان کے رفیق اور محب کی ہوتی ہے تاہم جب ان کے خامہ زرنگار سے اس کی روداد سامنے آتی ہے تو مشفق خواجہ کے لاغر مرادآبادی یا مشتاق یوسفی کے مرزا عبدالودود بیگ جیسی ہو جاتی ہے جہاں سر دلبراں کو حدیث دیگراں کے رنگ میں پیش کرنے اور روداد سفر کو دل چسپ بنانے کے لیے اس غریب کا جا اور بے جا استعمال بڑی بے رحمی سے کیا جاتا ہے- ۲۲ر نومبر سے ۹ر دسمبر ۲۰۱۰ تک ہونے والا سفر پاکستان بھی ہم نے ساتھ ہی کیا، لیکن اس سے قبل کہ موصوف سے میں روداد سفر لکھنے کے ارادے کا اظہار کرتا، حسب معمول جام نور کے ۱۳ر صفحات پر یہ سفرنامہ اس نوٹ کے ساتھ موصول ہوا: "اس سفرنامے کو جام نور کے اداریے کے کالم میں من وعن شائع کر دو، ورنہ..........." - اس "ورنہ" کے ساتھ ہی رہے سہے ارادے کی بھی کمر ٹوٹ گئی- اس دھمکی آمیز نوٹ کے بعد تو یہ سفرنامہ بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیے تھا، لیکن "سوواں خصوصی شمارہ" اور پھر "محدث اعظم نمبر" کی اشاعت کی وجہ سے اس کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی-

دوستی کے بھی اپنے ادب آداب ہوا کرتے ہیں، اس میں کسی قسم کی غرض شامل نہیں ہوتی، بس شرط اول وفاداری ہے، جس میں ایک دوست دوسرے دوست کے ساتھ رج کے محبت کرتے ہیں- ہم دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے- اس لیے ایک دوسرے کے سو نہیں ہزاروں خون معاف ہیں، اس میں حد قصاص کی گنجائش نہیں نکلتی- چنانچہ اسی جذبے کے ساتھ یہ علمی و فکری سفرنامہ بھی حاضر ہے- جب مضمون میں مذکور واقعات کی غلط بیانی کے تعلق سے کوئی تردد ہو تو ایڈیٹر حضرات یہ لکھنا نہیں بھولتے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں" اور جہاں یقین ہو وہاں غالباً "دروغ بر گردن راوی" لکھ کر اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر جن رسالوں کے قارئین کا علمی و ادبی ذوق نہایت معیاری ہو ان کے مدیروں کو ایسے جملوں کے استعمال کی زحمت نہیں اٹھانے پڑتی- مجھے خوشی ہے کہ میں ایسے جملوں کے استعمال کرنے سے بری ہوں، شاید ایسے ہی موقعے پر اہل زبان یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"- **خ- نورانی**

کچھ تو رنگین ہے یوں ہی لب و رخسار کی بات
اور کچھ خونِ جگر ہم بھی ملا دیتے ہیں

مجھے خوشتر کے ساتھ سفر کرنے کے ایسے ایسے تلخ تجربات ہو چکے ہیں کہ ہر سفر کا اختتام اس قسم پر ہوتا ہے کہ "یہ میرا تمہارے ساتھ آخری سفر ہے" مگر مجھے ہر بار اپنی اس قسم پر قائم رہنے میں اتنی ہی دشواری پیش آئی ہے جتنی انتخابات میں کئی بار ہارے ہوئے امیدوار کو اگلا الیکشن

نہ لڑنے کا فیصلہ کرنے میں ہوتی ہے، میں ہزار کوشش کے باوجود اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا، ہر بار کچھ ایسے حالات بن جاتے ہیں کہ مجھے اپنی یہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے- ہندستان کے طول وعرض میں ہمارے اتنے سفر ایک ساتھ ہو چکے ہیں اگر میں کسی پروگرام میں اکیلا جاؤں تو لوگ پوچھتے ہیں کہ مولانا خوشتر نورانی صاحب نہیں آئے، اور یہی سوال لوگ خوشتر سے بھی کرتے ہیں-

بیرون ملک ایک ساتھ یہ ہمارا پہلا سفر تھا، اس سفر کے اسباب کچھ یوں بنے کہ ہمیں Q T.V کی جانب سے پروگرام کی ریکارڈنگ کا دعوت نامہ موصول ہوا، اس دعوت نامہ کو Q T.V کے اسٹوڈیو سے جام نور کے آفس تک پہنچانے میں محترم صبیح رحمانی صاحب نے ''حد اوسط'' کا کردار ادا کیا، منطق کی کتابوں میں ''حد اوسط'' گرا کر ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، مگر صبیح گرنے والوں میں نہیں ہیں وہ تو اس پورے سفر میں شکل اول کے بدیہی نتیجے کی طرح سر پر مسلط رہے- علمی، ادبی اور مذہبی حلقوں میں صبیح رحمانی کی شناخت کے متعدد حوالے ہیں، نعت گو، نعت خواں، نعتیہ ادب کے عالمی میگزین نعت رنگ کے مدیر اعلیٰ، صاحب طرز ادیب ونثر نگار اور پھر Q T.V سے وابستگی نے ان کو عالمی سطح پر متعارف کروا دیا ہے، دنیا صبیح کی ان حیثیتوں سے متاثر ہو تو ہو مگر ہم جیسے آشفتہ سر تو ان کے اس لیے گرویدہ ہیں کہ وہ یاروں کے یار ہیں- صبیح سے واقفیت نعت رنگ کے ذریعے ہوئی اور جام نور نے ہمیں صبیح کے مطالعہ کی میز تک پہنچایا، گزشتہ سفر پاکستان میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی، ہم تو اسی وقت تاڑ گئے تھے کہ:

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

جب وہ گزشتہ جون میں انڈیا ''پدھارے'' تو وہی ہوا جو ہونا تھا کہ

آپ سے پھر تم ہوئے پھر تو کا عنواں ہو گئے

پاکستان کا ویزہ ہندستانیوں کو بہت آسانی سے مل جاتا ہے بشرطے کہ آپ کے پاس کوئی بہت بڑا سورس ہو یا پھر آپ صاحب کرامت ہوں، اپنے بارے میں ان دونوں میں سے کوئی بھی بات کہنا خود ستائی ہوگی لہٰذا میں خوشتر کے حق میں اس مصرعے کے ساتھ دست بردار ہو رہا ہوں کہ

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بہر حال کسی طرح ویزہ حاصل کیا، پہلے ۲۵؍اکتوبر کو روانگی کا پروگرام بنا مگر درمیان میں عرس قاسمی مارہرہ شریف کی وجہ سے ۱؍نومبر کی ٹھہری، ٹکٹ بھی کنفرم کروالیا گیا مگر عین وقت پر میرے گردے میں پتھری کا درد ہو گیا، پتھری پر یاد آیا کہ ایک بڑی شخصیت کے گردے میں چند پتھریاں ہو گئیں تو ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا کہ ''مولانا ایسا لگتا ہے کہ قدرت اندر سے آپ کو سنگسار کر رہی ہے''، میرے درد پر خوشتر نے یہ پھبتی کسی کہ یار پتھری کا علاج کروا کر پاکستان چلو کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹی وی پر لائیو پروگرام چل رہا ہو اور تم اچانک پیٹ پکڑ کے درد سے کراہنے لگو، میں نے اس بے موقع مذاق کے جواب میں وہی کیا جو ایک مہذب آدمی کسی غیر شریفانہ مذاق کے جواب میں کرتا ہے یعنی خاموش رہا- آخر کار ۲۲؍نومبر کو روانگی طے ہوئی، دوپہر میں تین بجے کی فلائٹ تھی، ائیر پورٹ جا کر معلوم ہوا کہ فلائٹ ایک گھنٹہ لیٹ ہے، کامن ویلتھ گیمز اپنے تمام تر گھٹالوں اور بدعنوانیوں کے باوجود ملک کی راجدھانی دہلی کو بہت کچھ دے گئے، ان گیمز کی برکتوں سے دہلی کا انٹرنیشنل ائیر پورٹ بھی محروم نہیں رہا، غریبی، بے روزگاری، اور کثیر آبادی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تیسری دنیا کے اس ترقی پذیر ملک کا ائیر پورٹ اب کسی بھی جہت سے ترقی یافتہ ملکوں کے ائیر پورٹ سے کم نہیں ہے، دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا ہم نے اندر ہی ایک ریسٹوراں کا انتخاب کیا اور کھانے کا آرڈر دیا، اسی درمیان خوشتر نے اپنے بیگ سے اپنی نئی شائع شدہ کتاب ''روبرو'' کی دو جلدیں نکالیں اور میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے مجھے داد طلب نگاہوں سے دیکھا، میں نے کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی اور کہا کہ ''ہاں اچھی چھپی ہے مگر تحقیق وتفہیم اور خامہ تلاشی کے معیار کی نہیں ہے''، یہ الگ بات ہے کہ کتاب واقعی دیدہ زیب اور خوبصورت چھپی ہے روبرو دراصل ان انٹرویوز کا مجموعہ ہے جو اب تک جام نور میں شائع ہو چکے ہیں، ان انٹرویوز کو مرتب نے تین جلدوں میں ترتیب دیا ہے، پہلی جلد میں علما و مشائخ، دوسری میں ادبا، شعرا اور مفکرین، تیسری میں ملی اور سیاسی شخصیات، فی الحال دو جلدیں منظر عام پر آئی ہیں ان پر خوشتر کا ایک وقیع مقدمہ بھی ہے جو مسلم صحافت کے مختلف تاریخی ادوار پر روشنی ڈالتا ہے، اور بلاشبہ شایان مطالعہ ہے-

اسی دوران کراچی سے مولانا حسین عطاری کا فون آیا انہوں نے یہ اطلاع دی کہ کل مولانا کوکب نورانی صاحب ساؤتھ افریقہ کے دورے

پر جارہے ہیں لہٰذا ان سے آج ہی ملاقات کرنا ہوگی، ہم نے فوراً مولانا کو فون لگایا انہوں نے محبت آمیز خفگی کا اظہار کیا کہ "اللہ کے بندوں پہلے سے اطلاع تو کردیتے کہ کس تاریخ میں آرہے ہو تاکہ میں اپنا پروگرام اسی کے مطابق بناتا"، خیر خدا خدا کر کے فلائٹ کا وقت ہوا، پاکستان انٹر نیشنل ایئر لائن (P.I.A) کے طیارے نے دہلی ایئر پورٹ سے پرواز بھری، ہم پورے دو گھنٹے ڈرے سہمے بیٹھے رہے کہ اب کوئی مرد مجاہد اٹھے اور یہ اعلان کرے کہ یہ طیارہ کراچی نہیں بلکہ پیرس جائے گا، میں اسے ایفل ٹاور سے ٹکرانے کے لیے ہائی جیک کر رہا ہوں، مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور ہم بخیر وعافیت شام چھ بجے کراچی ائرپورٹ پر اتر گئے، قانونی کاروائیوں سے گزر کر باہر نکلے، مجھے لینے کے لیے میرے عم مکرم حضرت عبدالمجید اقبال قادری صاحب اور دیگر کئی رشتہ دار واحباب موجود تھے، خوشتر کے استقبال کے لیے حضرت قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی صاحب کے صاحبزادے مولانا سرور مصطفیٰ اعظمی صاحب اور دیگر افراد آئے تھے- میرا قیام اقبال میاں صاحب کے گھر ہونا تھا اور خوشتر کو قاری صاحب کے دولت خانے پر قیام کرنا تھا، ایئر پورٹ سے ہم لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے-

پاکستان آکر ایک مسئلہ ہمیشہ پریشان کرتا ہے کہ یہاں میرے ملنے والوں کے تین طبقے ہیں ایک رشتہ داروں کا، دوسرا طبقہ اہل علم وادب کا اور تیسرا وابستگان خانقاہ قادریہ کا، ان تینوں میں وقت کی تقسیم کے سلسلے میں انصاف کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، اعزہ سے لڑائی مول نہیں لی جاسکتی، اہل علم وادب میں میری ذاتی دلچسپی ہوتی ہے، لہٰذا احباب سلسلہ ہی نقصان میں رہتے ہیں اور ان کے ساتھ خود میں بھی- رشتہ داروں کے بارے میں برادرم اکرام احمد رزاقی صاحب کا کہنا ہے کہ پہلے میں سمجھتا تھا کہ آپ کے کچھ رشتہ دار پاکستان چلے گئے ہیں، مگر حضرت کے ساتھ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ صرف کچھ ہندستان میں رہ گئے ہیں باقی سب پاکستان میں ہیں-

میں صبح سویرے بدایوں سے چلا تھا، بدایوں سے دہلی تک کا ۵ر گھنٹے کا سفر، پھر ہوائی سفر اور خوشتر کی گفتگو کی تھکن، جس کی وجہ سے اس وقت کہیں جانے کی ہمت نہیں تھی مگر کوکب صاحب سے ملاقات ضروری تھی، طے یہ پایا کہ مولانا حسین عطاری خوشتر کو لیتے ہوئے ادھر آئیں گے اور مجھے ساتھ لیتے ہوئے کوکب صاحب کے گھر جائیں گے، پروگرام کے مطابق ہم بعد عشا کوکب صاحب کے دولت کدے پر پہنچے، مولانا اپنی "سدا بہار جوانی" کے ساتھ گرم جوشی سے ملے، ان کی لائبریری بہت عمدہ ہے، میں نے کتابوں کی الماریوں پر ایک سرسری نظر ڈالی تو منھ میں پانی آگیا، کوکب صاحب بین الاقوامی سطح کے خطیب ہیں، عالم ہیں، ادیب وناقد ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ باغ وبہار شخصیت کے مالک ہیں، جس کا اندازہ ان کے پر لطف S.M.S سے ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ اکثر کرم فرماتے رہتے ہیں، ہم دونوں ہی ان سے بے تکلف ہیں لہٰذا باتوں میں کب رات کے دو بج گئے پتہ ہی نہیں چلا، چلتے وقت انہوں نے پھر وہی کیا جو گزشتہ سال بھی میرے ساتھ کیا تھا، یعنی پہلی بار کسی ایسے خطیب سے سابقہ پڑا جو نذرانہ لینے کے ساتھ ساتھ نذرانہ دینے کا بھی حوصلہ رکھتا ہے، ہمارے ہزار (مصنوعی) انکار کے باوجود انہوں نے زبردستی ہم دونوں کی جیب میں پانچ پانچ ہزار روپے رکھ دیے-

۲۳ر نومبر کو صبح آمد لکھوانے کی قانونی کاروائی کرنا تھی، دفتر میں جا کر اندازہ ہوا کہ سرکاری دفاتر اور ان کے عملے کا حال تقریباً دونوں ملکوں میں یکساں ہے، اس سے فارغ ہو کر Q.T.V کے اسٹوڈیو پہنچے، صبیح رحمانی استقبال کو موجود تھے، حاجی عبدالرؤف صاحب (چیرمین Q.T.V) سے ملاقات ہوئی، بعض اہم معاملات پر گفتگو ہوئی، دوپہر کا کھانا حاجی صاحب نے اپنے ساتھ کھلایا، حاجی صاحب بزرگوں بالخصوص سلطان الہند خواجہ غریب نواز کے بڑے معتقد ہیں، میرے ساتھ وہ جس طرح پیش آئے اس سے اندازہ ہوا کہ بزرگوں کی نسبتوں کا بھی بڑا احترام کرتے ہیں، اس کے بعد صبیح رحمانی کے آفس میں پروگرامز کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں میٹنگ ہوئی، پورا شیڈول تیار ہوا، اسی درمیان صاحبزادہ تسلیم صابری بھی تشریف لے آئے، خوشتر سے یہ ان کی پہلی ملاقات تھی، جناب عزیز احسن صاحب بھی موجود تھے، مغرب باجماعت وہیں اسٹوڈیو میں ادا کی گئی، صبیح اور تسلیم صابری کی آج ریکارڈنگ تھی، اس لیے ہم لوگوں نے اجازت لی اور کل آنے کا وعدہ کر کے واپس ہوئے- کھانا کھا کر میں نے گھر میں کتابوں کی الماریوں کا جائزہ لیا تو "جہان حمد" کے قرآن نمبر نے اپنی طرف متوجہ کیا، اس ضخیم نمبر کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرا مضمون "قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ" تقریباً ۶۰ر صفحات میں پورا کا پورا

شائع کر دیا گیا ہے، پاکستان میں حمد و نعت پر تحقیقی و تنقیدی کام کے سلسلہ میں جو تحریک چل رہی ہے یہ مجلّہ بھی اسی کا علمبردار ہے، مجلّے کے مدیر جناب طاہر سلطانی صاحب سے گزشتہ سفر میں ملاقات ہوئی تھی۔

۲۴ر نومبر کو پروگرام Q.Time میں صاحبزادہ تسلیم احمد صابری کے ساتھ خوشتر کا انٹرویو ریکارڈ ہونا تھا، ہم تقریباً ۱۲ر بجے اسٹوڈیو پہنچے، کھانا صبیح کے آفس میں ہوا، خوشتر تسلیم کے ساتھ سیٹ پر چلے گئے، صبیح رحمانی مجھے Q.T.V کے ریسرچ سینٹر میں لے گئے، یہاں ایک اچھی لائبریری ہے، جس میں علوم اسلامیہ، تاریخ اور ادب کی کتابوں کا ایک اچھا انتخاب ہے، یہیں المجلس العلمی کے ڈاکٹر عامر طس اور ڈاکٹر علی عمران صاحب سے ملاقات ہوئی، یہ دونوں حضرات اسی سینٹر میں خدمات انجام دیتے ہیں، ڈاکٹر علی عمران صاحب کا خاص موضوع تفسیر و علوم قرآن ہے، صبیح نے ان کو بتایا کہ میں نے ازہر میں اسی موضوع میں تخصص کیا ہے، تو وہ بہت خوش ہوئے، ڈاکٹر علی عمران وسیع المطالعہ روشن خیال اسکالر ہیں، کافی دیر ان سے علمی مذاکرہ ہوا، جس میں صبیح اور ڈاکٹر عامر طس بھی شریک ہو گئے، چند آیتوں کے اردو ترجمے کو لے کر مجھے ان سے اختلاف رائے ہو گیا، سنجیدہ اور علمی گفتگو رہی، ہم دونوں نے اپنے اپنے دلائل دیے مگر محفل کے اختتام تک ہم دونوں ایک دوسرے کو مطمئن کرنے میں ناکام رہے۔

پروگرام کے مطابق آج ہمیں دعوت اسلامی کے عالمی مرکز ''فیضان مدینہ'' کا دورہ کرنا تھا، تسلیم صابری کے ساتھ کچھ شاپنگ وغیرہ کرنا تھی، اور رات میں مفتی حسین عطاری کے گھر دعوت تھی، ہم نے عصر کی نماز مرکز فیضان مدینہ میں ادا کی، مرکز کا معائنہ کیا، مدنی چینل کا اسٹوڈیو ہمیں دکھایا گیا، طبیعت مسرور ہوئی کہ بڑے پیمانے پر علمی، اصلاحی اور دعوتی کام ہو رہا ہے، یہاں سے فراغت کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق تسلیم صابری ایک جگہ ہمارے منتظر تھے، ہم نے کچھ دیر ان کے ساتھ شاپنگ کی پھر وہ اپنے گھر لے کر آ گئے، یہاں چائے اور وائے سے تواضع کی پھر ہم لوگ مفتی حسان عطاری کے دولت خانہ پر پہنچے، یہاں مولانا حسین عطاری بھی موجود تھے، مفتی حسان عطاری دعوت اسلامی کے مرکزی دار العلوم سے فارغ ہیں اور دعوت اسلامی کے دار الافتا میں فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دیتے ہیں، فقہ و افتا کے علاوہ حدیث و علوم حدیث کا اچھا درک رکھتے ہیں، ان کا تازہ کارنامہ صحیح بخاری کی تخریج و تحقیق ہے، اس کی پہلی جلد ابھی کچھ عرصہ قبل شائع ہوئی ہے، یہ ان کے خلوص و محبت کا ہی کارنامہ ہے کہ مجھ جیسے کوتاہ قلم سے صحیح بخاری پر عربی میں مقدمہ لکھوا کے چھوڑا، فون اور ای میل کے ذریعے ان سے علمی تبادلہ خیال ہوتا رہتا ہے، گزشتہ سفر میں بھی انہوں نے اپنے گھر پر ضیافت کی تھی، اس بار بھی ان کی پر خلوص دعوت کے آگے ہمارا کوئی بہانہ نہیں چلا، مولانا حسین عطاری عرف غلام احمد رضا نوجوان عالم ہیں، دعوت اسلامی کے شعبہ رابطہ علما سے متعلق ہیں، دینی جذبہ رکھتے ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ با اخلاق، ملنسار اور خوش گفتار ہیں، پاکستان بھر کے اہل علم سے رابطے میں رہتے ہیں، ان کے یہ رابطے ہمارے بھی کام آتے ہیں، مولانا حسان کے گھر میں ایک اچھی لائبریری ہے، جس میں زیادہ کتابیں حدیث اور علوم حدیث سے متعلق ہیں، بقول خوشتر ''آپ تو کتابوں کی الماری پر ایسے لگتے ہیں جیسے گیہوں میں گھن'' اگر اس جملے سے خوشتر گھن کی اس عادت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ گیہوں دیکھتے ہی بے تابانہ اس سے لپٹ پڑتا ہے تو مجھے اس تشبیہ پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن اگر وہ لفظ گھن سے کوئی اور معنی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس تشبیہ پر میرا احتجاج درج کیا جائے، خیر کچھ وقت حسان صاحب کی لائبریری میں گزارا، پر تکلف کھانا کھایا، اور رات میں اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔

۲۵ر نومبر کا دن بے پناہ مصروفیت کا گزرا، میں اپنے گھر سے روانہ ہو کر خوشتر کو لیتا ہوا Q.T.V کے اسٹوڈیو پہنچا، تقریباً ۱۲ بجے ریکارڈنگ شروع ہوئی، پہلی ریکارڈنگ پروگرام ''نقطۂ نظر'' میں تھی اس میں جناب شبیر ابو طالب ہمارے میزبان تھے، موضوع تھا اسلامی صحافت اور اس کے تقاضے، یہ چونکہ خوشتر کا خاص موضوع ہے، اس لیے انہوں نے خوب ہاتھ دکھائے میں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا مگر سہرا خوشتر کے سر رہا، اس کے فوراً بعد پروگرام ''یوتھ کاونسلنگ'' میں ریکارڈنگ ہونا تھی، جس میں نوجوانوں کے مسائل پر گفتگو ہوئی، اس میں میری اور خوشتر کی الگ الگ ریکارڈنگ تھی۔ آج چونکہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یوم وصال تھا لہٰذا یوم عثمان کے سلسلے میں شام ۶ر بجے سے ۸ر بجے تک دو گھنٹے کا خصوصی پروگرام تھا، جو لائیو ٹیلی کاسٹ ہونا تھا، اس میں جنید اقبال ہمارے میزبان تھے، پروفیسر نور احمد زئی، ڈاکٹر نور احمد شاہتاز اور مولانا سید مظفر شاہ صاحب ساتھی مقررین تھے،

اس میں خوشتر صاحب موجود نہیں تھے، انہوں نے موقع غنیمت جانا اور صبیح رحمانی کے ساتھ شاپنگ پر نکل گئے، رات نو بجے خصوصی پروگرام ''ملاقات'' ریکارڈ ہونا تھا، جس میں صاحبزادہ تسلیم صابری کے ساتھ ہم دونوں کا انٹرویو تھا، یہ ایک گھنٹے کا پروگرام تھا، تقریباً گیارہ بجے ہم ریکارڈنگ سے فارغ ہوئے، میں نے اپنی کار واپس کر دی تھی، لہٰذا طے پایا کہ صبیح رحمانی خوشتر کو اپنے ساتھ ڈراپ کر دیں اور تسلیم صابری نے مجھے اپنے ساتھ لے لیا، ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا، تسلیم جتنی نفیس گفتگو کرتے ہیں کھانے پینے کے معاملے میں بھی اتنے ہی نفاست پسند اور اعلیٰ ذوق کے مالک ہیں، کراچی کے مشہور علاقے حسین آباد میں فوڈ اسٹریٹ کے نام سے ایک سڑک ہے جہاں انواع واقسام کے عمدہ اور بہترین کھانوں کے ریسٹوراں ہیں، تسلیم مجھے وہاں لے کر پہنچے، یہاں میرے پرہیز کا مسئلہ آڑے آیا، بہر حال کچھ نہ کچھ کھایا، ساڑھ بارہ بجے تسلیم صابری مجھے میرے گھر چھوڑتے ہوئے واپس ہوئے۔

۲۶ رنومبر کو جمعہ تھا، خوشتر کو میں نے گاڑی بھیج کر اپنے گھر ہی بلا لیا، جمعہ کی نماز ہم نے قریب کی مسجد میں ادا کی، دوپہر کے کھانے کے بعد ہم جناب حکیم محمود احمد برکاتی صاحب سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئے، علمی حلقوں میں حکیم صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، خانوادۂ شاہ ولی اللہ اور خاندان خیر آباد پر وہ اتھارٹی ہیں، حکیم صاحب کا علم وفضل اور ذاتی اوصاف اپنی جگہ مگر میں ان سے اس لیے بھی رشتۂ محبت وعقیدت رکھتا ہوں کہ وہ حضرت مولانا برکات احمد ٹونکی (تلمیذ مولانا عبد الحق خیر آبادی) کے پوتے ہیں، میرے دادا حضرت عاشق الرسول مولانا عبد القدیر بدایونی مولانا برکات احمد ٹونکی کے شاگرد تھے، ہمارے یہاں نسبتوں کا کتنا احترام کیا جاتا ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو مجھے عم مکرم اقبال میاں صاحب نے سنایا، انہوں نے فرمایا کے غالباً ۱۹۵۷ء یا ۵۸ میں جب حضرت عاشق الرسول آخری بار کراچی تشریف لائے تو صدیق بھائی کے گھر قیام پذیر تھے، صحت بہت خراب تھی بغیر سہارے کے خود سے اٹھ بھی نہیں سکتے تھے، مریدین ومتوسلین کا مجمع تھا، اسی درمیان حکیم محمود احمد برکاتی صاحب (جو اس وقت نوجوان تھے) آئے اور مصافحہ کر کے ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھ گئے، کافی دیر کے بعد کسی نے حضرت کو بتایا کے مولانا برکات احمد ٹونکی کے پوتے یہاں تشریف فرما ہیں، یہ سنتے ہی حضرت اپنی تمام تر کمزوری کے باوجود بے ساختہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے، حکیم صاحب کو آگے بلایا، دست بوسی کی اور فرمایا کہ'' صاحبزادے آپ نے اپنا تعارف بھی نہیں کروایا اگر آپ ایسے ہی اٹھ کر چلے جاتے تو میں قیامت میں استاذ کو کیا جواب دیتا''، استاذوں اور استاذ زادوں کے ادب واحترام کی یہ ساری روایتیں اب صرف زبانوں اور کتابوں ہی کی زینت ہیں (الا ماشاء اللہ) گزشتہ سفر میں بھی میں نے حکیم صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہو کر نیاز حاصل کیا تھا، انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ یہ سنایا تھا کہ ایک مرتبہ مولانا ماہر القادری حکیم صاحب سے کہنے لگے کہ لوگ ہمیں وہابی کہتے ہیں حالانکہ شیخ کا نام عبد الوہاب تھا، لہٰذا یہ لفظ وہابی زبان کی رو سے کسی طرح درست نہیں ہے، اس پر حکیم صاحب نے فرمایا کہ ''مولانا پھر تو آپ کو بجائے ماہر القادری کے اپنے آپ کو ماہر عبد القادری کہنا چاہیے''، اس پر ماہر صاحب سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ حکیم صاحب نہایت بزرگانہ شفقت کے ساتھ ملے، گفتگو کا زیادہ حصہ خیر آبادیات سے متعلق رہا، ہم نے مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب کا پیغام ان تک پہنچایا کہ علامہ فضل حق خیر آدی کی وفات کے ڈیڑھ سو سال مکمل ہونے کی مناسبت سے سال ۲۰۱۱ء کو علامہ فضل حق خیر آبادی کے سال کے طور پر منایا جائے، اس تجویز پر حکیم صاحب بہت خوش ہوئے، اور اس سلسلہ میں مفید رہنمائی فرمائی، خوشتر نے جام نور کے لیے حکیم صاحب سے انٹرویو کی درخواست کی، حکیم صاحب کے مطب کا وقت ہو رہا تھا لہٰذا طے ہوا کہ سوالات لکھ کر بھجوا دیے جائیں، حکیم صاحب جوابات رقم کر کے ارسال فرما دیں گے۔

تقریباً شام پانچ بجے حکیم صاحب سے اجازت لی، اب ہمارا کارواں کراچی یونیورسٹی کے شیخ زائد اسلامک سینٹر کی طرف رواں دواں تھا، جہاں ڈاکٹر نور احمد شاہتاز صاحب سے ملاقات طے ہوئی تھی، ڈاکٹر صاحب کا مجلہ ماہنامہ فقہ اسلامی میرے پاس آتا ہے اور پچھلے سفر میں مَیں نے اپنی کتابیں شاہتاز صاحب کو بھجوائی تھیں، اور پھر تعارف کے لیے جام نور کا حوالہ کافی تھا، گزشتہ رات اسٹوڈیو میں ریکارڈنگ کے دوران ڈاکٹر صاحب سے ملاقات بھی ہو چکی تھی، خوشتر اپنی صحافیانہ عادتوں سے یہاں بھی باز نہیں آئے اور اپنا ریکارڈنگ کا ساز وسامان نکال کر ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو کی فرمائش کر دی، شاہتاز صاحب نے بھرپور انٹرویو دیا، مغرب کی نماز ہم نے وہیں ادا کی

اور پھر اجازت لے کر واپس ہوئے۔

گھر واپسی پر برادرم فرید اقبال قادری صاحب نے مطالعہ کے لیے مجھے دو کتابیں دیں، "گلبانگ وحدت" اور دوسری "بہر زماں بہر زباں" دونوں کتابیں نور احمد میرٹھی کی مرتبہ ہیں، پہلی کتاب میں غیر منقسم ہندوپاک کے ۲۱۱ رغیر مسلم شعرا کا تعارف اور ان کا حمدیہ کلام جمع کیا گیا ہے، جب کہ دوسری میں ۳۹۱ رغیر مسلم شعرا کا نعتیہ کلام شاعر کے تعارف کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، غیر مسلم شعرا کے حمدیہ اور نعتیہ کلام پر ہندستان میں بھی کام ہوا ہے، لیکن میرے خیال میں نور احمد میرٹھی کا یہ کام زیادہ وقیع ہے، بہر زماں بہر زباں کی ورق گردانی کے دوران مجھے ایک جھٹکا سا لگا، میں گرسرن لال ادبی لکھنوی کا تذکرہ پڑھ رہا تھا، ان کے نعتیہ کلام کے ذیل میں ایک مثنوی بھی تھی، یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس مثنوی کے تقریباً ۲۳ راشعار حضرت عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر بدایونی کی مثنوی غوثیہ سے یا تو ہو بہو نقل کر دیے گئے ہیں یا پھر معمولی لفظی تحریف کے ساتھ شامل کر لیے گئے ہیں، حضرت عاشق الرسول نے یہ مثنوی اپنے سفر عراق کے دوران ۱۳۳۹ھ/۱۹۱۹ء میں نظم کی تھی، جو حضرت کے خلیفہ مولانا فخر الحسن قادری نے ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۰ء میں حیدرآباد سے شائع کی تھی، اور اس کے بعد سے کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے، گرسرن لال ادبی لکھنوی کی پیدائش ۱۹۰۲ء میں ہوئی یعنی جس وقت حضرت نے یہ مثنوی کہی ادبی صاحب اس وقت محض ۱۷ ربرس کے تھے، حضرت کی مثنوی میں ۹۴ رشعر ہیں جب کہ ادبی کی مثنوی ۴۸ ر اشعار پر مشتمل ہے، آپ اس کو توارد بھی کہہ سکتے ہیں مگر ایسے توارد پر قربان جایئے جو بیک وقت ۲۳ راشعار میں ہو گیا ہو۔

۲۷ رنومبر: نواب نظام الدین خاں حیدرآبادی مرحوم اور نواب سعادت یار خاں مرحوم کے خاندان کا خانقاہ قادریہ سے قدیمی رشتہ عقیدت ومحبت ہے، تقسیم کے بعد یہ خاندان پاکستان منتقل ہو گیا، کرنل احمد اشرف اسی خاندان کے فرد تھے، پچھلے سفر میں ان لوگوں سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی، راشد نواب اور ان کی بہن جویریہ قادریہ نے بہت اصرار کیا تھا کہ اس بار پاکستان آنا ہو تو ہمیں کچھ وقت ضرور دیں، آج دوپہر میں ان کے گھر جانا طے ہوا، ہم روانہ ہو ہی رہے تھے کہ جہان حمد کے مدیر جناب طاہر سلطانی تشریف لے آئے، ان سے کچھ دیر ان کے مجلّے کے سلسلے میں گفتگو ہوئی، انہوں نے اپنے مجلّے کی مجلس ادارت میں میرا نام ڈالنے کی اجازت چاہی، میں ان کے اصرار کے آگے انکار نہیں کر سکا۔ع...... وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

عم مکرم اقبال میاں اور مؤید بھائی کے ساتھ ہم روانہ ہوئے، ان کا قلعہ نما مکان دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ریاست حیدرآباد مرحوم ہو گئی، نوابی ختم ہو گئی مگر اس خاندان میں نوابانہ جاہ وحشمت کے آثار اب بھی باقی ہیں، انہوں نے اپنے خاندان کے دوسرے بہت سے افراد کو بھی کھانے پر مدعو کر لیا تھا، بہت اچھی گفتگو رہی، شریعت، روحانیت اور تصوف کے سلسلے میں بہت سے سوالات کیے گئے، میں نے اپنے محدود مطالعے کی روشنی میں اطمنان بخش جواب دیے، کھانا نہایت پرتکلف اور نوابی آن بان کے ساتھ تھا، البتہ "حیدرآبادی کھٹاس" ہر کھانے میں موجود تھی، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بُعدِ زمان ومکان کے باوجود ان لوگوں کی نسبت قادریت اب بھی بہت پختہ ہے۔

شام کو کراچی میں مقیم اہل بدایوں کی جانب سے استقبالیہ کا پروگرام تھا، یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ بدایوں کی تاریخ، شعر وادب اور تہذیب وثقافت پر بدایوں میں اتنا کام نہیں ہوا جتنا پاکستان میں رہنے والے اہل بدایوں نے کر دکھایا، بدایونی تہذیب وروایات کا ترجمان "ماہنامہ مجلّہ بدایوں" کا اجرا کراچی سے ہوا اور اس نے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اہل بدایوں کو ایک پلیٹ فارم دیا، یہ مجلّہ پابندی کے ساتھ کم از کم دس بارہ سال نکلتا رہا، اب یہ سہ ماہی ہو گیا ہے، اس کے علاوہ "دبستان بدایوں" کے نام سے ان لوگوں نے ایک انجمن قائم کی ہے جو مختلف میدانوں میں خدمات انجام دیتی ہے، حامی ویلفیئر ٹرسٹ کراچی بھی اہل بدایوں کا قائم کیا ہوا ایک فلاحی اور رفاہی ادارہ ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ کراچی میں بدایوں کے سلسلہ میں کوئی کام ہو اور اس میں محترم انور عزیز قادری بدایونی شامل نہ ہوں، انور عزیز مولوی محلّہ بدایوں میں پیدا ہوئے، مدرسہ قادریہ میں کھیلتے کودتے بچپن گزرا، پاکستان ہجرت کی، پھر پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا، ترقی کرتے کرتے لندن تک پہنچے، اس کے علاوہ بھی دنیا کے بہت سے ممالک میں رہے، زندگی کا زیادہ حصہ جکارتہ میں گزرا اس لیے "انور عزیز جکارتہ والا" کے نام سے مشہور ہیں، مجلّہ بدایوں، دبستان بدایوں اور حامی ویلفیئر ٹرسٹ ہر جگہ ایک اہم معاون اور سرگرم کارکن کی حیثیت سے موجود رہتے ہیں، حامی ویلفیئر ٹرسٹ کے صدر ہیں، جب کہ الحاج

وسیم عمر بدایونی ٹرسٹ کے سرپرست ہیں یہ حاجی سخاوت حسین قادری بدایونی کے خاندان سے ہیں، یہ استقبالیہ اسی ٹرسٹ کی جانب سے تھا، ساتھ میں عشائیہ کا اہتمام بھی تھا، تقریباً دو ڈھائی سو اہل بدایوں محفل میں موجود تھے، متعدد لوگوں کی بے موقع بے محل اور بے ربط تقریریں میں نے نہایت شرافت سے یہ خیال کر کے برداشت کیں کہ گویا یہ اس اعزاز کی قیمت ہے، ہم نے تمہیں اعزاز دیا تم نے ہماری تقریریں سنیں چلو حساب برابر ہو گیا، آخر میں میں نے بھی اظہار خیال کیا، کہیں کہیں مائک اتنا عمدہ ہوتا ہے کہ چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا، یہاں کا مائک بھی اسی قبیل کا تھا، وقت کافی ہو گیا تھا، اور پنڈال کے دوسری طرف سے برتنوں کے کھڑکنے کی آواز کے ساتھ کھانے کی خوشبوئیں بھی آرہی تھیں اس لیے میں نے لوگوں کے صبر وضبط کا زیادہ امتحان لینا مناسب نہیں سمجھا- کھانے اور ملنے ملانے میں کافی وقت ہو گیا، دیر رات گھر واپسی ہوئی-

۲۸ر نومبر کو ہماری ریکارڈنگ نہیں تھی، اس لیے چند لوگوں سے ملاقات کا پروگرام بنا لیا، خوشتر صاحب مولانا سرور مصطفیٰ اعظمی صاحب کے ساتھ بازار گئے ہوئے تھے، مجھے کچھ اعزہ اور احباب سلسلہ کے گھر جانا تھا، پھر دوپہر تین بجے وہ ہمارے گھر آئے اور ہم لوگ مولانا شاہ حسین گردیزی صاحب سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئے، شاہ حسین گردیزی صاحب کا نام ان کی کتاب ''حقائق تحریک بالاکوٹ'' کی وجہ سے علمی حلقوں میں معروف ہے، پھر ان کی تازہ تصنیف ''الذنب فی القرآن'' کو بھی علمی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی، اس کتاب میں ان کے اختیار کردہ موقف سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ان کی اس کاوش کی اہمیت اور وقعت سے نہیں، اس اختلافی مسئلہ پر زیادہ سے زیادہ جو مواد ہو سکتا تھا وہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں نہایت سلیقہ سے جمع کر دیا ہے، حضرت تاج الفحول کی فارسی کتاب تصحیح العقیدہ اور مفتی صدر الدین آزردہ کی کتاب منتہی المقال کا اردو ترجمہ کر کے شائع کر چکے ہیں، شاہ صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ملے، حالانکہ ہم لوگ کھانا کھا کر آئے تھے پھر بھی انہوں نے کھانے کا اہتمام کر لیا تھا، کھانے کے دوران مختلف موضوعات پر علمی تبادلۂ خیال ہوا، خوشتر صاحب یہاں بھی کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئے تھے چنانچہ انہوں نے شاہ صاحب سے جام نور کے لیے انٹرویو کی فرمائش کی، شاہ صاحب نے بڑا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کروایا، شاہ صاحب کے اخلاق و تواضع اور سادگی نے متاثر کیا، چلتے وقت گردیزی صاحب نے فرمایا کہ مولانا فضل رسول بدایونی اور حضرت تاج الفحول کی کتابیں اور تذکرے پڑھے اور سنے تھے آج آپ سے ملاقات کر کے ایسا لگتا ہے جیسے ان بزرگوں سے ملاقات ہو رہی ہے، شاہ صاحب سے اجازت لینے کے بعد اب ہماری اگلی منزل قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی صاحب کا دولت خانہ تھا، قاری صاحب حضرت صدر الشریعہ کے صاحبزادے ہیں اور اب ان معدودے چند لوگوں میں باقی بچے ہیں جنہوں نے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں، ان کے صاحبزادے مولانا سرور مصطفیٰ اعظمی صاحب نے آج شام کی چائے کا اہتمام کیا تھا اور کراچی کے کچھ دوسرے علما کو بھی مدعو کر دیا تھا، یہ سب لوگ جام نور کے مداح تھے اور ہم لوگوں سے ملنے کے مشتاق بھی، قاری صاحب سے میری ایک ملاقات ہندستان میں بھی ہو چکی ہے، وہ عمر کی جس منزل میں ہیں اس کی وجہ سے مجھے گمان تھا کہ وہ اس ملاقات کو بھول گئے ہوں گے، مگر ملتے ہی انہوں نے کہا کہ آپ سے گھوسی میں ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب کے گھر ملاقات ہوئی تھی، علما سے گفتگو ہوئی تو پتہ چلا کہ یہاں لوگ اسید الحق سے زیادہ ابو الفیض معینی کو یاد کرتے ہیں-

آج رات ہماری دعوت حضرت مولانا ڈاکٹر ابو الخیر زبیر صاحب نقشبندی کے دولت خانہ پر تھی، ڈاکٹر صاحب علمی اور روحانی خانوادے کے فرد ہیں، اور پھر انہوں نے اپنی ذاتی صلاحیتوں سے اپنے خانوادے کی عظمت کو چار چاند لگائے ہیں آپ حضرت مولانا رکن الدین الوری صاحب کے پوتے اور مفتی اعظم دہلی حضرت مفتی مظہر اللہ دہلوی کے نواسے ہیں، ممبر آف پارلیمنٹ اور وزیر بھی رہے، اس وقت جمعیت علمائے پاکستان کے صدر ہیں یہ وہی جمعیت ہے جس میں ایک زمانے تک مولانا عبد الحامد بدایونی صاحب صدر رہے اور ان کے بعد حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے زمانے تک اس کی مسند صدارت کو زینت بخشی، ڈاکٹر ابو الخیر زبیر صاحب علم بھی ہیں اور صاحب قلم بھی، مختلف تحقیقی موضوعات پر آپ کی متعدد کتابیں میرے مطالعے میں آچکی ہیں، آپ کے بڑے صاحبزادے صاحبزادہ عزیز ازہری ازہر شریف میں میرے دوست تھے، حیدرآباد (سندھ) میں آپ کی خانقاہ اور بہت عظیم الشان ادارہ ہے، صاحبزادہ عزیر صاحب نے مصر سے واپسی کے بعد اپنے ادارے کے نظام اور نصاب تعلیم

میں کچھ اصلاحات کر کے اس کو مزید بلندیوں تک پہنچایا ہے، عزیر صاحب کا اصرار تھا کہ حیدرآباد آجاؤ، مگر ویزہ کا مسئلہ تھا، گزشتہ سفر میں بھی انہوں نے کرم فرمایا تھا اور کراچی مجھ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے، میں نے فون پر کہا کہ پچھلی بار بھی آپ کے والد محترم سے نیاز حاصل نہیں ہو پایا تھا، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ حضرت سے ملاقات کی کوئی صورت نکالیں، اتفاق سے آج حضرت کراچی آنے والے تھے اس لیے آج رات کا وقت طے ہوا تھا، صاحبزادہ عزیر بھی حیدرآباد سے کراچی تشریف لے آئے، ہم لوگ تقریباً آٹھ بجے عزیر صاحب کے دولت خانہ پر پہنچے، حسب عادت عزیر صاحب بڑے تپاک اور محبت سے ملے بہت دیر تک ازہر کے زمانہ طالب علمی کی یادیں تازہ ہوتی رہیں، پھر حضرت ڈاکٹر زبیر صاحب سے نیاز حاصل ہوا، ان سے بھی خوشتر نے تفصیلی انٹرویو کیا، کھانے کے بعد ہم نے اجازت لی اور رات میں ۱۲ ربجے تک گھر پہنچے۔

۲۹ رنومبر کو شام میں ہمارے دو پروگرام ریکارڈ ہونا تھے، صبح میں میرے ایک عزیز جناب اظہر عباس ہاشمی صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے، پاکستان کے ادبی حلقوں میں یہ ایک جانا پہچانا نام ہے، کراچی کی ادبی اور شعری فضا کو اپنی مختلف سرگرمیوں سے گرم رکھتے ہیں، خود شاعر تو نہیں ہیں مگر ہزاروں شعر نوک زبان پر ہیں، دوپہر میں خوشتر ہمارے گھر آگئے، پھر ہم ایک ساتھ QT.V کے اسٹوڈیو پہنچے، ہم لوگ صبیح رحمانی کے آفس میں بیٹھے تھے کہ اچانک میرے فون پر کال آئی، معلوم ہوا کہ دعوت اسلامی کے دفتر سے فون ہے، انہوں نے بتایا کے امیر دعوت اسلامی مولانا الیاس قادری صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، کچھ دیر بعد مولانا کی آواز سنائی دی، محبت اور تواضع ان کی آواز اور انداز گفتگو دونوں سے ظاہر ہوتی ہے، انہوں نے فرمایا کہ آپ حضرات ایک وقت کا کھانا میرے ساتھ کھالیں، مگر ہمارے پروگرام اس طرح سیٹ تھے کہ وقت نکالنا مشکل ہو رہا تھا، غور وفکر کے بعد اگلے دن رات کی دعوت طے ہوئی، حالانکہ ہمیں صبیح رحمانی کی بہن کی شادی میں بھی اسی دن جانا تھا۔ کچھ دیر صبیح سے باتیں ہوتی رہیں پھر تسلیم صابری آئے اور ہمیں سیٹ پر لے گئے، پروگرام خوشبوئے حسان کی ریکارڈنگ ہونا تھی، اس پروگرام میں کسی بھی نعت گو شاعر کی شخصیت اور نعتیہ شاعری پر گفتگو کی جاتی ہے، تسلیم صابری اپنی باوقار شخصیت، خوبصورت آواز اور پرکشش لب ولہجے کے ساتھ اس پروگرام میں میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہیں، آج یکے بعد دیگرے دو پروگرام ریکارڈ ہونا تھے، ایک مفتی لطف بدایونی کی حیات اور شاعری پر دوسرا مولانا ہادی القادری بدایونی کی شخصیت اور شاعری پر، دونوں میں خوشتر میرے ساتھ تھے، ریکارڈنگ کے دوران بزرگ شاعر اور محقق محترم مہر وجدانی صاحب موجود رہے، یہ بھی بڑی باغ و بہار شخصیت ہے، عمر کے اس حصے میں کم ہی لوگ اتنے زندہ دل اور ظریف الطبع ہوتے ہیں، فارسی اور اردو کے کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر ہیں، QT.V میں اسکرپٹ رائٹر ہیں اور جگ استاذ ہیں، تسلیم صابری ان کو استاذ کہتے ہیں، لہٰذا ہم لوگ بھی ان کو استاذ کہنے لگے۔ لگ بھگ روز ہی ان سے ملاقات ہوتی تھی، نہایت سادگی سے قہقہہ بردوش جملے بولتے ہیں، اپنا دیوان بھی مرحمت فرمایا، اگلے دن مجھ سے پوچھا کہ حضرت کچھ ورق گردانی کی فرصت ملی؟ اس وقت تو واقعی فرصت نہیں ملی تھی، مگر بدایوں آکر جب میں نے دیوان کا مطالعہ کیا تو متاثر ہوئے بنا نہیں رہا۔

۳۰ رفروری کو صبح پروگرام "روشنی" میں خوشتر کی لائیو ٹرانس میشن تھی، جنید اقبال میزبان تھے، یہ پروگرام ہم نے اپنے گھر میں دیکھا، دن میں کچھ احباب اور اعزہ کے یہاں جانا تھا، مغرب کے وقت واپسی ہوئی، عشا کے بعد امیر دعوت اسلامی حضرت مولانا الیاس قادری صاحب کے گھر دعوت تھی، تقریباً آٹھ بجے ہم وہاں پہنچے، دعوت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے کچھ مخصوص افراد بھی موجود تھے، کھانے کے ساتھ مختلف دینی اور جماعتی موضوعات پر گفتگو بھی ہوئی، چونکہ ہمیں ابھی صبیح رحمانی کی بہن کی شادی میں بھی شرکت کرنا تھی، اس لیے بادل نہ خواستہ مولانا الیاس قادری صاحب سے اجازت لی، انہوں نے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، ہم شادی ہال پہنچے تو معلوم ہوا کہ شادی کیا ہے علما، شعرا، ادبا، اور نعت خوانوں کا اچھا خاصا اجتماع ہے، کیو ٹی وی اور نعت رنگ سے وابستہ اکثر افراد موجود تھے، لوگ الگ الگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے محو گفتگو تھے، مذہب وسیاست سے لے کر شعر وادب تک اور تحقیق وتنقید سے لے کر نعت خوانی کی دھنوں تک ہر قسم کا مسئلہ زیر بحث تھا، ہم بھی ایک حلقے میں بیٹھ گئے، جس میں تسلیم صابری، علامہ لیاقت حسین، مولانا حمزہ قادری، مہر وجدانی، عزیز احسن اور کئی دیگر اہل علم موجود تھے۔ ایک صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران

مولانا عبدالحامد بدایونی کا کئی بار تذکرہ کیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ان کو کس طرح جانتے ہیں انہوں نے بتایا کہ ”وہ نہ صرف یہ کہ میرے استاذ تھے بلکہ خاص مربی اور محسن بھی تھے میں نے ان کے ادارے جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں تعلیم حاصل کی ہے اور آج میں جو کچھ ہوں مولانا بدایونی کی ہی بدولت ہوں“ انہوں نے پوچھا کہ یہ سوال آپ نے کیوں کیا؟ میں نے بتایا اس لیے کہ وہ رشتہ میں میرے بھائی تھے، میرے دادا کے شاگرد اور خلیفہ تھے، یہ سن کر وہ کھڑے ہو گئے اور سینے سے لگا لیا، معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر محمد احمد قادری ہیں، کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات میں پروفیسر ہیں، ذی علم شخصیت ہیں یورپ میں کئی سال رہ کر دینی خدمات انجام دے چکے ہیں- آدھی رات کے قریب اس محفل شادی سے واپسی ہوئی-

۱ر دسمبر کو صبح کے پروگرام ”روشنی“ میں مجھے بولنا تھا، علامہ لیاقت حسین صاحب ساتھی مقرر تھے اور جنید اقبال ہمارے میزبان، سورۂ ہود کی چند آیات موضوع گفتگو تھیں، بہت اچھا پروگرام ہوا، دس بجے تک فارغ ہوئے، ناشتہ کیو ٹی وی کے ریسرچ سینٹر میں علامہ لیاقت صاحب کے ساتھ ہوا، کچھ دیر ان سے گفتگو ہوئی، تقریباً بارہ بجے تسلیم صابری اور سید مظفر شاہ صاحب بھی آ گئے، اب خوشتر صاحب کا انتظار تھا، جو توقع کے عین مطابق تاخیر سے آئے، سیدنا عمر فاروق کے سلسلہ میں خصوصی پروگرام کی ریکارڈنگ ہونا تھی، اس پروگرام میں تسلیم صابری میزبان تھے، میرا پروگرام علامہ لیاقت صاحب کے ساتھ تھا اور خوشتر کو سید مظفر شاہ صاحب کے ساتھ بولنا تھا، ریکارڈنگ سے فارغ ہوتے ہوتے شام کے چار بج گئے، جام نور کے لیے تسلیم صابری صاحب سے بھی انٹرویو لینا تھا، مگر اب تک وقت نہیں مل پایا تھا، ریکارڈنگ سے فرصت ملی تو خوشتر نے تسلیم صاحب سے انٹرویو کے بارے میں کہا، وہ بھی اس وقت فری تھے اور ہمیں بھی فی الحال اور کوئی کام نہیں تھا، لہٰذا انٹرویو شروع ہوا، اور بہت خوب رہا- مغرب کے بعد اسٹوڈیو سے واپسی ہوئی-

۲ر دسمبر: پاکستان میں کتابوں کی اصل منڈی تو لاہور میں ہے تاہم کراچی کا اردو بازار بھی اپنے اندر بڑے خزانے رکھتا ہے، آج خوشتر کی ریکارڈنگ تھی لہٰذا میں نے موقع غنیمت جان کر اردو بازار کا رخ کیا، اردو بازار بھی دہلی کے مٹیا محل کی طرح ہے، جس میں ہر قدم پر ایک مکتبہ ہے، تین چار گھنٹے کتابوں کے ساتھ گزرے تو ایک نئی توانائی بدن میں آ گئی، ایک کتب خانہ میں کتابیں دیکھنے لگا تو دکاندار نے پوچھا مولانا آپ کو کس قسم کی کتابوں کی تلاش ہے؟ مذہبی؟ ادبی؟ تاریخی یا اور کچھ؟ اب میں اس کو کیا بتاتا کہ پڑھنے پڑھانے کے معاملے میں ہمارا معدہ بہت مضبوط واقع ہوا ہے، تفسیر کشاف اور صحیح ابن حبان سے منفلوطی کی عبرات ونظرات تک اور محمد حسین آزاد کی آب حیات سے لے کر قرۃ العین حیدر کی ”گردش رنگ چمن“ تک ہم ہر قسم کا مواد ہضم کر سکتے ہیں- یہاں بہت سی کتابیں خریدیں- دوپہر میں ایک عزیز کے گھر دعوت میں جانا ہوا-

آج دوپہر نقطۂ نظر پروگرام میں خوشتر کی ریکارڈنگ تھی، موضوع تھا ”اتحاد امت امکان اور طریقہ کار“ شبیر ابو طالب صاحب میزبان تھے جب کہ ساتھی مقرر کی حیثیت سے دیوبندی مکتب فکر کے مفتی زبیر تھے، خوشتر اتحاد امت کے داعی ضرور ہیں مگر اپنے مسلکی تشخص کی قیمت پر نہیں، وہ اپنے بنیادی اصول وعقائد میں کسی کمپرومائز کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا اتحاد امت کے اس پروگرام میں بھی افتراق امت واقع ہو گیا، اور خوشتر صاحب نے اپنے میزبان اور ساتھی مہمان دونوں سے اختلاف کیا، اس موقع پر مجھے جمال الدین افغانی کا وہ تاریخی جملہ یاد آیا جو انہوں نے اتحاد امت سے مایوس ہو کر کہا تھا کہ اتفق المسلمون علیٰ ان لا یتفقوا! مسلمانوں میں یوں تو بہت سے اختلافات ہیں مگر اس بات پر تمام مسلمان متفق ہیں کہ ہم کبھی متفق نہیں ہوں گے-

اس سفر میں ابھی تک چند کو چھوڑ کر باقی عزیز واقارب سے ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا، اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ فرداً فرداً سب کے گھر جاتا، اس مسئلہ کا حل ابا جی (عم مکرم حضرت عبدالمجید اقبال قادری صاحب) نے یہ نکالا کہ تمام رشتہ داروں کو رات کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کر لیا، جو اعزہ ہندستان میں ہیں ان سے تو آئے دن کا ملنا ہوتا ہے، مگر جو لوگ پاکستان میں ہیں ان سے یہ میری دوسری اور بعض سے پہلی ملاقات تھی، اس لیے رشتوں کو سمجھنے میں بڑی دماغی کسرت کرنا پڑی، یوں تو مجھے رشتوں کو سمجھنے اور یاد رکھنے میں ہمیشہ دشواری ہوتی ہے، مگر یہ مسئلہ یہاں اس لیے اور گمبھیر ہو گیا کہ ہمارے خاندان میں آپس میں شادی در شادی ہو کر رشتے اتنے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ایک ایک آدمی سے میرے پانچ پانچ رشتے بن رہے ہیں، مؤید اقبال قادری ایک رشتے

سے میرے تایازاد بھائی ہیں، تو دوسرے رشتے سے پھوپھی زاد بھائی بھی ہیں چوں کہ وہ میرے والد کی سگی خالہ زاد بہن کے بیٹے ہیں، تیسرے رشتے سے وہ میرے بہنوئی ہیں، اور پھر ہم دونوں مل کر بیک وقت ربیعہ آپا کے چچازاد بھائی بھی ہوتے ہیں اور دیور بھی اور مزے کی بات یہ کہ ربیعہ آپا میری پھوپھی ہوتی ہیں کیوں کہ وہ میرے والد کی رضاعی بہن ہیں- رشتوں کا یہ مسئلہ اس وقت اور سنگین ہو جاتا ہے جب مجھے پتا چلتا ہے کہ قاسم عثمانی صاحب کے بیٹے محمود عثمانی اور مسعود عثمانی جو مجھ سے عمر میں بڑے ہیں میرے پر پوتے ہیں، مولانا عبد الماجد بدایونی میرے بھائی تھے جو عمر میں میرے دادا سے بھی چند سال بڑے تھے اور میرے والد کی پیدائش سے ۸/ سال پہلے انتقال فرما گئے-

سب اعزہ سے ملاقات ہوئی پر تکلف کھانا ہوا، دعوت میں نثار اشرفی صاحب بھی تھے جو میرے بھتیجے (اور بھانجے بھی) احمد فرید قادری کے خسر ہیں، یہ خانوادہ اشرفیہ کی پاکستانی شاخ سے نسبت بیعت وارادت رکھتے ہیں- پاکستان میں حضرت سید شاہ احمد اشرف اشرفی الجیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، ان کا وصال ۲۰۰۵ء میں ہوا، اب ان کے صاحبزادے مولانا ڈاکٹر ابو المکرم سید محمد اشرف صاحب خانقاہ اشرفیہ کراچی کے صاحب سجادہ ہیں، گزشتہ سال احمد کی شادی میں ان سے نیاز حاصل ہوا تھا انہوں نے خانقاہ میں ہماری دعوت بھی کی تھی، ان کی محبت اور اخلاق نے متاثر کیا تھا، اس بار بھی میں ان سے ملاقات کا مشتاق تھا اور ان کو بھی ہمارے آنے کی اطلاع ہو گئی تھی، انہوں نے اس بار بھی دعوت کے لیے اصرار کیا مگر وقت کی کمی کے سبب یہ طے ہوا کہ ابھی ان سے ملاقات کر لی جائے، کھانے کے بعد میں نثار صاحب کے ساتھ خانقاہ میں حاضر ہوا، مزارات پر فاتحہ پڑھی، ان کے بھائی مولانا حکیم سید اشرف جیلانی بھی نہایت متواضع اور خوش اخلاق ہیں اور اپنے خاندان کی روایتوں کے امین، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ خانقاہوں میں جو پرانی روایتیں اب ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں ان کو ان بھائیوں نے کسی نہ کسی حد تک سنبھال رکھا ہے، چائے کا دور چلا، بہت سے معاملات پر تبادلہ خیالات ہوا، میں نے اپنی کچھ کتابیں انہیں پیش کیں، انہوں نے بھی اپنی کچھ کاوشیں عنایت کیں، رات میں تقریباً ساڑھے بارہ بجے واپسی ہوئی-

۳/ دسمبر آج جمعہ کا دن تھا ناشتہ میں ایک عزیز کے گھر جانا ہوا، جمعہ کی نماز قریب کی مسجد میں ادا کی، جمعہ کے بعد کچھ احباب سلسلہ سے ملاقات طے تھی، آج خوشتر کو دار العلوم نوریہ رضویہ کلفٹن میں جمعہ کی امامت وخطابت کے جوہر دکھانا تھے، SMS کے ذریعے کافی اشتہار کیا جا چکا تھا لہٰذا معمول سے زیادہ لوگ نماز کے لیے آئے، بہت سے علما بھی خاص طور سے خوشتر کو سننے کے لیے آئے تھے، جناب نے ایک پر مغز، علمی اور فکری تقریر سے عوام اور علما دونوں کو متاثر کیا- میں وہاں موجود نہیں تھا اس معلومات کا واحد ذریعہ خود خوشتر کی ذات ہے لہٰذا دروغ بر گردن راوی میں اس کے صدق وکذب کا ذمہ دار نہیں ہوں، نماز کے بعد وہیں کھانے کی دعوت بھی تھی جس میں علما اور چند معززین بھی مدعو تھے وہاں بھی علما سے علمی تبادلہ خیال ہوا-

رات کو الحاج وسیم عمر کے گھر دعوت تھی، کچھ مخصوص اہل بدایوں اور بھی موجود تھے، وہیں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے بتایا کہ میں بدایوں کا رہنے والا ہوں اور آپ کے والد محترم کا مرید ہوں، تعارف کے بعد پتہ چلا کہ یہ جناب غلام غوث سیفی ہیں جو پاکستان کے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ جنگ کراچی کے مدیر ہیں، مجھے حیرت ہوئی کہ ع

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ہے

۴/ دسمبر آج دن میں دار العلوم امجدیہ میں استقبالیہ محفل تھی، یہ پاکستان کے چند قدیم اور معیاری اداروں میں سے ایک ہے، بانی ادارہ حضرت مفتی ظفر علی نعمانی صاحب کے صاحبزادے مولانا ریحان رضا نعمانی آج کل اس کے مہتمم ہیں، وہ خوشتر کو ساتھ لیتے ہوئے ہمارے گھر تشریف لائے، پھر ہم لوگ ایک ساتھ دار العلوم کے لیے روانہ ہوئے، وہاں علما اور طلبہ منتظر تھے، تمام اساتذہ سے ملاقات ہوئی، خاص طور پر علامہ عبد المصطفیٰ ازہری صاحب کے صاحبزادے مولانا اکرام المصطفیٰ اعظمی صاحب سے مل کر خوشی ہوئی، پہلے ادارہ کے آفس میں علما اور اساتذہ سے مخصوص نشست ہوئی، اس کے بعد ایک وسیع وعریض حال میں محفل کا انعقاد کیا گیا، تلاوت ونعت کے بعد مولانا اکرام المصطفیٰ اعظمی صاحب نے ہم لوگوں کا تعارف کرایا، پھر سید مظفر شاہ صاحب نے خطاب فرمایا، اس کے بعد پہلے خوشتر اور پھر مجھے دعوت خطاب دی گئی، آخر میں مہتمم ادارہ مولانا ریحان رضا نعمانی صاحب نے اختتامی خطاب فرمایا، خوشتر کو آج اپنے کچھ اعزہ کے یہاں جانا تھا دوپہر میں میری بھی ایک جگہ دعوت تھی، لہٰذا یہاں سے ہماری راہیں جدا

ہو گئیں، شام کو پروگرام فکر نو میں میری ریکارڈنگ تھی، اس لیے میں دعوت سے فارغ ہو کر سیدھا اسٹوڈیو پہنچا، پروگرام کا عنوان روحانیت تھا، دانش جلالی میزبان تھے، آج رات میں عزیز احسن صاحب کے گھر دعوت تھی، پروگرام یہ طے ہوا تھا کہ خوشتر اپنے عزیزوں سے مل کر اپنی قیام گاہ پر ہمارا انتظار کریں گے اور ہم لوگ ان کو لیتے ہوئے عزیز احسن کے یہاں جائیں گے، مگر کسی وجہ سے خوشتر مصروف ہو گئے اور انہوں نے معذرت کر لی، میں، صبیح رحمانی اور ڈاکٹر طارق شریف زادہ ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر طارق شریف زادہ کا نام اس سفر نامہ میں پہلی بار آیا ہے لہٰذا ان کا شایان شان تعارف کرانا ضروری ہے، شریف زادہ بڑی نستعلیق اور کڑھی ہوئی شخصیت کا نام ہے، جامہ زیب آدمی ہیں، لباس کا ایک خاص سلیقہ اور ذوق رکھتے ہیں، ان کی شخصیت میں سب سے اہم چیز ان کے خوب صورت بال ہیں، جن کو سنوارنے میں یقیناً ان کا خاصا وقت صرف ہوتا ہوگا لیکن ہمیں اس سے کیا؟ ان کا وقت ہے جس طرح چاہیں صرف کریں، جملوں میں پھلجڑیاں چھوڑتے ہیں، دو جملوں کے درمیان ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ اتنا وقفہ ضرور رکھتے ہیں کہ بندہ داد دے سکے، بقول صبیح شاعر بھی ہیں، صبیح کے بے تکلف دوست ہیں لہٰذا ہمارے بھی دوست ٹھہرے، ہم تینوں جناب عزیز احسن صاحب کے دولت خانہ پر پہنچے، عزیز احسن نعت رنگ کے مستقل قلم کار ہیں، نعت اور تنقید نعت کے حوالے سے ان کا بہت کام ہے، خود بھی نعت کے عمدہ شاعر ہیں، نعت کے موضوع پر ان کی کتابیں ''نعت کی تخلیقی سچائیاں''، ''نعت کے تنقیدی آفاق''، اور ''ہنر نازک ہے''، علمی ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں، ان سے مل کر خوشی ہوئی، بیٹھتے ہی نعت کی تنقید کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی جیسے بھرے بیٹھے ہوں، بمشکل وہ تنقید کے بحر ذخار سے باہر آئے اور کھانا لگوایا، صبیح نے ان کے پائے کی بہت تعریف کی تھی میرا مطلب ہے ان کے گھر کے پکے ہوئے پائے کی، کھانا لگا تو معلوم ہوا کہ گرما گرم پائے ہمارے منتظر ہیں۔ میں پچھلے کچھ ماہ سے پیٹ کی ایک تکلیف میں مبتلا ہوں، جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے گوشت اور مرچ مسالوں پر سخت پابندی لگا دی ہے، سفر میں بھی حتی الامکان پرہیز کرتا رہا، لیکن پائے کی کافرادائی نے ''پرہیز گاری'' کا سارا بھرم توڑ دیا، کھانے سے فارغ ہو کر نشست گاہ میں آئے شغل چائے نوشی شروع ہوا تو پھر شعر و سخن کی بات آگئی، ہم نے اصرار کر کے عزیز احسن صاحب سے ان کا کلام سنا اور محظوظ ہوئے، صبیح نے عزیز احسن کو یہ بتا کر مجھے دار پر چڑھا دیا کہ اسید شاعر بھی ہیں، اب عزیز احسن جیسے نقاد کے سامنے غزل سنا کر کوئی کیوں اپنی شامت کو دعوت دے، شاید یہی سوچ کر ابو الفیض معینی کے سامنے ہزار اصرار کے باوجود صبیح نے کچھ نہیں سنایا، بہر حال میں نے بھی اپنی شاعری سنائی، اب شمع مشاعرہ شریف زادہ صاحب کے سامنے تھی، جو غزل انہوں نے اپنی کہہ کر سنائی اس کے تین شعر یاد رہ گئے۔

اس حد تک بھی جا سکتا ہوں — اپنا آپ گنوا سکتا ہوں
اپنے ساتھ نہیں ہوں لیکن — تیرا ساتھ نبھا سکتا ہوں
اتنی بھوک لگی ہے مجھ کو — میں دھوکا بھی کھا سکتا ہوں

آخر میں عزیز صاحب نے اپنی لائبریری دکھائی، جو انتہائی بے ترتیب ہونے کے باوجود بڑی وقیع ہے، وہاں کچھ دیر وقت گزارنے کو دل چاہتا تھا مگر رات کافی ہو رہی تھی اس لیے ہم نے اجازت لی۔

۵ر دسمبر: اتوار کی وجہ سے آج صبیح رحمانی کی چھٹی تھی، لہٰذا سیر و تفریح کا پروگرام بنا، صبیح اپنی گاڑی میں خوشتر کو لیتے ہوئے آئے اور مجھے لے کر کلفٹن کے ساحل سمندر کی طرف روانہ ہوئے، وہیں ساحل کے کنارے ایک عمدہ ریسٹوراں میں دوپہر کا کھانا کھایا گیا، وہیں کھانے کے دوران جام نور کے ''نعت نمبر'' کا خاکہ تیار کیا گیا، جو شاید اٹھتے وقت وہیں رہ گیا کیوں کہ اس کے بعد سے اب تک میں نے خوشتر صاحب کی زبان سے نعت نمبر کا کوئی تذکرہ نہیں سنا ہے، خدا اس نعت نمبر کو ''سواد اعظم نمبر'' ہونے سے بچائے۔ ساحل سمندر ہی پر صبیح نے ہم دونوں کو زبردستی اونٹ کی سواری کروا دی، ایک اونٹ پر ہم دونوں سوار ہوئے، اونٹ کو سفینۃ الصحرا کہا جاتا ہے، اونٹ بڑی شان سے خراماں خراماں ہمیں لے کر چلا، اونٹ کا سفر کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا اندازہ اسی دن ہوا، زمین سے اتنی اونچائی پر ہلتے ڈلتے چلنے میں مجھے عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا، خوشتر یہ ظاہر کرنا چاہ رہے تھے کہ وہ نہ صرف یہ کہ بے خوف ہیں بلکہ شتر سواری سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، بہت چہک رہے تھے، میں نے کہا اللہ کے بندے خاموش رہو کہیں آپ کی اس نغمہ سرائی کو اونٹ حدی خوانی سمجھ بیٹھا تو ابھی قابو سے باہر ہو جائے گا اور آپ کی ساری شوخی دھری کی دھری رہ جائے گی، ساحل کا ایک لمبا چکر لگا کر خدا خدا کر کے اونٹ واپس اپنے ٹھکانے پر

آیا، اونٹ کے بیٹھنے کی بھی اپنی ایک عجیب ادا ہے، میں نے اونٹ سے اتر کے کہا کہ اس جملہ کا مطلب آج سمجھ میں آیا کہ "دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے" اس پر خوشتر نے چٹکی لی کہ اگر محاوروں کو عملی طور پر سمجھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو لگے ہاتھوں اونٹ کے منہ میں زیرہ رکھ کے بھی دیکھ لیں۔ شتر سواری کے بعد صبیح گھوڑے سواری کے درپے ہو گئے بڑی مشکل سے ہم لوگوں نے جان بچائی۔ یہاں سے کیماڑی کے ساحل پر گئے، وہاں سیر وتفریح کر کے صدر میں ایک آئس کریم پارلر میں گئے، صبیح کے بقول یہ کراچی کی مشہور آئس کریم کی دکان ہے، آئس کریم واقعی مزے دار تھی، وہیں ایک بوڑھا کوئی ساز بجا رہا تھا، اس کو دیکھ کر اچانک خوشتر کا "جذبہ افادۂ عامہ" جاگ اٹھا بولے کہ یہ طنبورہ ہے اور اسی کے اوپر فارسی کی وہ مشہور مثل ہے کہ "من چہ می سرائم وطنبورہ من چہ می سرائد"، پھر داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے کہ یقیناً آپ کی معلومات میں اضافہ ہوا ہوگا، میں نے جواب دیا کہ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ یہ طنبورہ ہے اور فارسی کی یہ مثل بھی چند ماہ پہلے میں نے ہی آپ کو بتائی تھی، مگر اب آپ اپنی معلومات میں یہ اضافہ کر لیں کہ ساز کے تار کو عربی میں الوَتر کہتے ہیں، اسی پر عربی کا یہ محاورہ ہے کہ ضرب علی وتر حساس جس کا قریب المعنیٰ محاورہ اردو میں ہے کہ "دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا"، صبیح جواب تک خاموش تھے، بولے کہ اب آپ دونوں حضرات اجتماعی طور پر اپنی معلومات میں یہ اضافہ کر لیں کہ یہ طنبورہ نہیں ہے بلکہ اس کو گٹار کہتے ہیں، میں نے کہا کہ بھائی یہ مراثیوں کا موضوع ہے اس سلسلہ میں ہماری معلومات محدود ہے لہٰذا آپ جو کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہوگا۔

آج رات میرے بھتیجے عبد العلی محمد قادری کی منگنی کی رسم تھی، اس لیے میں گھر واپس آگیا اور خوشتر صبیح رحمانی کے ساتھ کہیں اور چلے گئے۔

۶ردسمبر کو کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر محمد احمد قادری صاحب سے ملاقات کا پروگرام تھا، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے، دن میں ایک بجے ان سے ملاقات طے ہوئی، میں اور خوشتر موئید بھائی کی رہنمائی میں کراچی یونیورسٹی پہنچے، پروفیسر صاحب کے چیمبر میں ان کے بھائی پروفیسر عبد اللہ قادری صاحب اور ڈاکٹر عابد حسنین صاحب بھی موجود تھے، ڈاکٹر عابد صاحب نے ہندستان میں مسلمانوں کے حالات کے بارے میں سوال کیا، خوشتر نے اس کا بڑا نپا تلا جواب دیا، گفتگو آگے بڑھی تو پروفیسر عبد اللہ قادری صاحب نے حدیث اختلاف امتی رحمۃ کی صحت وضعف کے سلسلے میں میری رائے جاننا چاہی، میں نے تفصیلی جواب دیا، پھر خوشتر نے حسب عادت ڈاکٹر محمد احمد قادری صاحب سے بھی انٹرویو کیا، پھر ڈاکٹر صاحب نے یونیورسٹی کے مختلف شعبے دکھائے اور کئی اہم شخصیات سے ملاقات کروائی، پانچ بجے واپسی ہوئی، ہماری اگلی منزل "بیدل لائبریری" تھی، وعدے کے مطابق صبیح رحمانی بھی وہیں پہنچ گئے، اس لائبریری کی ایک خصوصیت اس کے مجلات کا سیکشن ہے، پرانے مجلات کی فائلیں بڑے اہتمام سے رکھی گئی ہیں، میں نے "العلم" (کراچی) کی فائلیں نکلوائیں اور ان میں ڈوب گیا، صبیح رحمانی نے خوشتر کو بھی کسی رسالے کی فائل پکڑا کر مصروف کر دیا، میں نے فوٹو کاپی کے لیے العلم کے متعدد مضامین پر نشان لگائے، لائبریرین جناب زبیر صاحب بڑے کوآپریٹو آدمی ثابت ہوئے، اس لائبریری میں میرے لیے دوسری پُرکشش چیز پروفیسر ایوب قادری صاحب کا ذخیرہ کتب تھا، جس میں کافی تعداد میں قلمی نوادرات بھی ہیں، پروفیسر موصوف کے صاحبزادے نے ان کا سارا ذخیرہ بیدل لائبریری کو وقف کر دیا ہے، یہاں مجھے فارسی کی ایک ایسی قلمی کتاب ملی جس کی مجھے مدتوں سے تلاش تھی، ان شاء اللہ اس کا ترجمہ کر کے شائع کروں گا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں فوٹو کاپی کو دیں، لائبریری یوں تو آٹھ بجے بند ہو جاتی ہے، مگر ہم لوگ نو بجے تک وہاں رہے اور استفادہ کرتے رہے۔

۷ردسمبر کی صبح جناب مجاہد بریلوی صاحب کے گھر ناشتہ کی دعوت تھی، مجاہد بھائی میرے بہنوئی (پھوپھی زاد بہن کے شوہر) ہیں اور سید الطاف بریلوی صاحب (مدیر سہ ماہی العلم کراچی) کے صاحبزادے ہیں اور خود بھی صحافی ہیں، ان کے گھر بھی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے، پچھلے سفر میں بھی انہوں نے مجھے چھوٹ دے دی تھی کہ جو کتاب پسند آئے وہ لے لو اور اس بار بھی، میں نے کتابوں کی الماریوں کا جائزہ لیا اور چند کتابیں منتخب کر لیں۔

دوپہر میں المجلس العلمی کی لائبریری کا دورہ کیا، خوشتر اور موئید بھائی بھی ساتھ تھے ادھر سے صبیح بھی آگئے، یہ لائبریری بھی بہت قیمتی ہے، بالخصوص عربی کا اچھا ذخیرہ ہے، یہاں بھی میں نے دو جلدوں پر مشتمل ایک نایاب کتاب کی فوٹو کاپی کروائی، خوشتر نے اپنے مطلب کی چیزیں

تلاش کیں، صبیح کو آفس میں کچھ کام تھا، وہ چلے گئے، ہم نے بانی پاکستان کے مقبرہ کا رخ کیا کہ یہ بھی کراچی میں ایک دیکھنے کی چیز ہے، یہاں سے فارغ ہو کر میں اور موئید بھائی پھر بیدل لائبریری میں آگئے، خوشتر کو کہیں دعوت میں جانا تھا، وہ چلے گئے، لائبریری بند ہونے کے وقت تک میں پھر کتابوں میں سر کھپاتا رہا، اور کئی کام کی چیزیں فوٹو کاپی کے لیے دے دیں، رات میں تسلیم صابری صاحب کی طرف سے دعوت تھی، وہ گھر پر آکر مجھے اپنے ساتھ لے گئے، ایک بہت اعلیٰ ریسٹوراں میں کھانے کا اہتمام تھا، ہم جب وہاں پہنچے تو حسب وعدہ صبیح رحمانی اور اپنی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ڈاکٹر طارق شریف زادہ موجود تھے، طے یہ ہوا تھا کہ خوشتر دعوت سے فارغ ہو کر یہیں آجائیں گے، کافی دیر انتظار کیا گیا پھر ہم نے کھانا شروع کیا، کھانے کے دوران خوشتر بھی آگئے، کھانے سے فارغ ہو کر کراچی کی ایک مشہور دکان پر آئس کریم کھائی گئی، بہت پر لطف گفتگو رہی، صاحبزادہ تسلیم صابری کی یہ ایک بڑی خوبی ہے کہ جیسی شستہ اور نپی تلی گفتگو وہ ٹی وی پر کرتے ہیں ویسی ہی گفتگو نجی محفلوں میں بھی کرتے ہیں، ورنہ بہت سے لوگ کیمرے کے سامنے الگ انداز میں بولتے ہیں اور نجی گفتگو میں ان کا لب ولہجہ الگ ہوتا ہے، میں اور خوشتر تسلیم کے ساتھ گاڑی میں تھے، صبیح اور شریف زادہ دوسری گاڑی میں، راستہ میں تسلیم نے بڑی تمہید باندھ کر ایک لطیفہ سنایا، جس پر وہ خود ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے، لطیفہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا مگر پھر بھی ہم نے ہنسی میں ان کا ساتھ دیا، اب بندے کو اتنا بھی حقیقت پسند نہیں ہونا چاہیے، آخر میزبان کے بھی تو کچھ حقوق ہوتے ہیں۔

۸ر دسمبر یہ ہمارا کراچی میں آخری دن تھا کل ہماری واپسی ہونا تھی، ۱۱ر بجے ہم موئید بھائی کے ساتھ اردو بازار کی طرف روانہ ہوئے، اس دن تشنگی باقی رہ گئی تھی، شام چار بجے تک کتب خانوں کی خاک چھانتے رہے، بہت سی کتابیں خریدیں اور کچھ کے بارے میں تفصیلات نوٹ کیں، پاکستان میں ایک بڑا کام لوگوں نے یہ کیا ہے کہ بے شمار تراث کی کتابوں کے اردو ترجمے کر دیے ہیں، فتح الباری، تاریخ طبری، طبقات ابن سعد، البدایہ والنہایہ، اسد الغابہ، حلیۃ الاولیا، بیہقی کی شعب الایمان اور سب سے بڑھ کر تو مسند احمد بن حنبل وغیرہ کے اردو ترجمے مارکیٹ میں دستیاب ہیں، پاکستان کے شائع شدہ کچھ ترجمے ہندستان میں بھی شائع ہو گئے ہیں، ایک دکان پر مغربی اسکالرز کی کتابیں نظر آئیں، میں نے کیرین آرمسٹرانگ کی The Battle For God خریدی، اور خوشتر نے صموئل ہینگٹن کی مشہور زمانہ کتاب The Clesh of Civilizaeion اور جان پرکنز کی The Secret History of American Empire خریدی، شام کو گھر واپسی ہوئی تو مولانا حسین عطاری موجود تھے، یہ مجموعہ رسائل فضل رسول شائع کروا کر لائے تھے، اس مجموعے میں سیف اللہ المسلول مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی کے چھ رسائل ہیں، یہ تمام رسائل پہلے الگ الگ تاج الفحول اکیڈمی نے شائع کیے، پھر حضرت اشرف میاں مارہروی کی تقریظ اور مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب کے طویل اور وقیع مقدمے کے ساتھ "مجموعہ رسائل فضل رسول" کے نام سے رضا اکیڈمی ممبئی سے شائع ہوئے، رضا اکیڈمی والے مجموعے میں پانچ رسائل ہیں مولانا حسین عطاری نے اس میں مزید ایک اور رسالہ شامل کر کے اس کو اور بھی مفید بنا دیا، میری کتاب احادیث قدسیہ بھی مولانا حسین عطاری ہی کی کوشش سے پاکستان میں شائع ہوئی تھی، اور اب وہ "تحقیق و تفہیم" کی اشاعت کی تیاری کر رہے ہیں، رب قدیر جزائے خیر عطا فرمائے۔

آج یہاں آخری رات تھی، اس لیے صبیح نے کہا کہ آج میری طرف سے الوداعی ڈنر ہوگا، خوشتر کو لیتے ہوئے وہ ہمارے گھر آئے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ شریف زادہ صاحب بھی گاڑی میں موجود تھے، "لال قلعہ" نامی ریسٹورنٹ پہنچے، علامہ لیاقت حسین صاحب کا گھر قریب ہی تھا، صبیح نے فون کر کے ان کو بھی بلا لیا، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کھانا زیادہ پر لطف تھا یا شریف زادہ کی گفتگو، ہاں اگر صرف صبیح اور خوشتر گفتگو کرتے تو یہ فیصلہ بہت آسان ہو جاتا، کھانے سے فراغت کے بعد علامہ لیاقت صاحب نے کہا کہ اتنا قریب آگئے ہیں تو میری مسجد اور ادارہ بھی دیکھ لیں، ہم لوگ پیدل ہی ان کی مسجد کی طرف چل پڑے جو چند قدم پر تھی، واقعی بڑی پر شکوہ اور عالی شان مسجد تھی، روانہ ہوتے وقت ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے مگر علامہ لیاقت اور خوشتر محو گفتگو رہے، علامہ صاحب نے خوشتر کو اپنا کارڈ دیا جو خوشتر نے بڑے ادب سے لیا، جیسے ہی خوشتر گاڑی میں بیٹھے فوراً شریف زادہ نے فقرہ کسا کہ "آپ تو علامہ لیاقت کا کارڈ اتنی عقیدت سے لے رہے تھے جیسے علامہ اقبال کا کارڈ لے رہے ہوں" یہ کہہ کر شریف زادہ صاحب نے داد طلب نگاہوں سے ہم لوگوں کو دیکھا اور ہم ایک بے ساختہ قہقہے پر قابو نہ پا سکے ——— بقیہ صفحہ 23 پر ملاحظہ کریں

ذیشان احمد مصباحی☆

رضویات: پس منظر و پیش منظر

امام احمد رضا کانفرنس ممبئی منعقدہ ۲۶، ۲۷ فروری ۲۰۱۱ء کے لیے لکھی گئی تحریر، نظر ثانی کے بعد قارئین کی نذر ہے

فقیہ اسلام حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمہ اپنے زمانے کی نابغۂ روزگار شخصیت تھے- بلاشبہ وہ ایک جہان معنی تھے- ان کی ہشت پہلو شخصیت کو جس طرف سے بھی دیکھیے وہ اپنے آپ میں منفرد و ممتاز نظر آتی ہے- انہوں نے پوری ایک صدی کو متاثر کیا- ایک زمانہ ان کا معترف ہے- ان کے افکار و خیالات نے نہ صرف اپنے دور کو متاثر کیا اور نہ وہ صرف اپنے عہد میں مجالس علما اور عوام میں مقبول اور زیر بحث رہے بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ان کے افکار و خیالات اور تحقیقات پر بحث و نظر اور علم و تحقیق کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا- یہ بات خود اپنے آپ میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی عبقریت کا آخری ثبوت ہے اور سچائی بھی یہی ہے کہ عہد رضا سے اب تک عرب و عجم میں ان کا ثانی کوئی دوسرا نظر نہیں آتا-

یہ بات ایک تسلیم شدہ حقیقت کے طور پر اب سامنے آتی جا رہی ہے کہ اعلیٰ حضرت ایک شخص نہیں ایک تحریک کا نام ہے اور بقول مخدوم گرامی حضرت شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی ''اعلیٰ حضرت کی ذات سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے-'' اور جہاں تک حالات اور واقعات کی تبدیلی سے بعض جزوی مسائل اور فروعی نظریات سے اختلاف کا مسئلہ ہے تو یہ کوئی نیا نہیں، اصول فقہ کا قاعدہ ہے: تختلف الاحکام باختلاف الزمان- حالات کے بدلنے سے مسائل بھی بدل جاتے ہیں-

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی تاریخ اسلام کی اس مقدس لڑی کے ایک فیروز بخت دانہ ہیں جس میں شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی، شیخ محقق، غزالی و رازی اور امام احمد بن حنبل، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ جیسی عظیم شخصیات ہیں جنہوں نے اسلام کے علمی کاررواں کو آگے بڑھایا، جو بلاشبہ راہ حق کے استعارے ہیں، جن کے علمی و فکری سرمایے کے احسان سے بعد والے نہ سبک دوش ہوئے اور نہ رہتی دنیا تک ہوں گے- جزوی طور پر بعد والوں نے اختلاف تو ضرور کیا یا حالات کی تبدیلی کے سبب مختلف اقوال میں ترجیح دینے کا عمل تو ضرور کیا لیکن ان شخصیتوں کا انکار یا ان کے احسانات کی ناسپاسی کسی کے لیے ممکن نہیں رہی-

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی کتاب حیات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات بڑی حیرت انگیز نظر آتی ہے کہ جو لوگ اس زمانے میں خود اپنے طور پر ماہ و نجوم کی حیثیت رکھتے تھے، وہ بھی اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے اکتساب فیض کو غنیمت اور چند لمحے کی صحبت کو سرمایۂ حیات تصور کرتے تھے- مولانا امجد علی اعظمی، مولانا ظفر الدین بہاری، مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مولانا سید محمد کچھوچھوی، مولانا سید سلیمان اشرف بہاری، اور ان جیسے دوسرے بہت سے علما ایسے تھے جو خود اپنی شناخت آپ تھے- ہر شخص اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب تھا لیکن یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ فاضل بریلوی ان کے بیچ ستاروں کی جھرمٹ میں ماہ کامل نظر آتے ہیں- ان عہد ساز شخصیات کا بارگاہ فاضل بریلوی میں سجدۂ نیاز لٹانا بس یوں ہی تو نہیں ہوسکتا- کچھ تو ایسی بات تھی جو تعلق اور عقیدت کیشی پر مجبور کر رہی تھی-

ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح امام ابو حنیفہ قدس سرہ نے ماہرین کی ایک ٹیم اپنے گرد جمع کر لی تھی اور ان کی مشاورت اور تعاون سے فقہ اسلامی کی تدوین کا فریضہ انجام دیا اسی طرح اعلیٰ حضرت نے اپنے دور میں متخصصین کی چند جماعت اکٹھا کر لی تھی جن کے تعاون سے خصوصیت کے ساتھ فقہ اسلامی پر ایسا کام کیا جس کی نظیر نہ تو بعد میں نظر آتی ہے اور نہ اس سے قبل کی قریب کی صدیوں میں کوئی اس کی مثال ملتی ہے-

کسی بھی شخصیت کی عظمت کا راز اس شخصیت کے پھیلاؤ سے سمجھا جاتا ہے- شخصیت جب بڑی ہوتی ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے گھر کی چہار دیواری سے باہر آتی ہے، پھر اس کی عظمت اس کی علاقائی حدوں کو توڑتی ہے پھر ملکوں کی سرحدیں مٹ جاتی ہیں- شخصیت جس قدر بڑی ہوتی جاتی ہے انفس و آفاق میں اس کے چرچے اسی قدر بڑھتے چلے جاتے ہیں- کسی عبقری شخصیت کی شناخت یہ بھی ہے کہ اسے جغرافیہ کی لکیریں اور زمانے کی رفتار پابجولاں نہ کرسکیں- عبقری شخصیتیں کسی ایک گھر، کسی ایک خطہ، یا کسی ایک زمانے کی نہیں ہوتیں اور نہ ہی گردش زمانہ ان کے گہرے نقوش کو مٹا سکنے میں کامیاب ہوتی

☆zishanmisbahi@gmail.com

ہے- اس تناظر میں جب ہم اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو پھر ہمیں ان کی عبقریت اور آفاقیت میں کوئی شبہ نہیں رہتا اور ان یارانِ کرم پر افسوس ہوتا ہے جو اعلیٰ حضرت سے عقیدت کے نام پر ان کی شخصیت کو کسی گھر یا خطے میں محدود کرنے کی غیر شعوری کوشش کرتے ہیں-

روایتوں میں مذکور ہے کہ نبی کا کوئی وارث نہیں ہوتا- اس سے ایک لطیف نکتہ یہ بھی ملتا ہے کہ علوم نبوت پر بھی کسی کی وراثت یا کسی کی جاگیر نہیں ہوتی- وہ خلقِ خدا کے عام استفادے اور ہدایت کا سرمایہ ہوتے ہیں اور ان میں سب کا حصہ ہوتا ہے- جس طرح امام ابوحنیفہ، امام غزالی، امام رازی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شخصیت خطے اور کنبے سے بہت بلند ہے، بلاتمثیل اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی شخصیت بھی زمان و مکان کی قید سے اب آزاد ہو چکی ہے - اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس شخصیت پر قبضہ کرنے کے زعم میں اسے محدود کرنے کی غیر شعوری کوشش سے باز آجائیں- اسے اس کا صحیح حق دیں- اس پر تجارت اور سیاست نہ کریں- بلکہ ہر ممکن طور سے اس کے علمی ذخیرے کی تقسیم و ترسیل کریں اور جدید اسالیب اور جدید سائنسی و تکنیکی ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اسلام کے متوارث علمی و فکری سلسلے کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں-

یہ بات بالکل سچ ہے کہ بیسویں صدی میں مختلف جہات سے فاضل بریلوی کے فکر و فن پر جس معیار اور وسعت سے کام ہونا چاہیے تھا اتنا نہیں ہو سکا- لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ جتنا کام فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کی شخصیت اور فکر و فن پر کیا گیا اتنا بیسویں صدی کی کسی اور شخصیت پر نہیں ہوا- انیسویں اور بیسویں صدی کے ممتاز علمائے ہند میں غالباً اعلیٰ حضرت کی شخصیت ان میں سب سے زیادہ خوش نصیب ہے جو دینی سطح پر علمی کام کرنے والوں کی مرکز توجہ بنی رہی- بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر کام کرنے کا جوش اتنا زیادہ بڑھا کہ اس عہد اور اس سے ماقبل عہد کے اکابر اہل سنت پر کام کرنے کا رجحان ہی کالعدم ہو گیا- فکر رضا کی اشاعت کا جذبہ ایک جنون کی شکل اختیار کر گیا اور ہر شخص نے ایک ہی راگ الاپنا شروع کر دیا- اس سے جہاں ایک طرف دوسرے علمائے اہل سنت اور ان کی خدمات فراموش ہو گئیں اور بعض ممتاز سی شخصیتیں دوسروں کے کھاتے میں چلی گئیں تو دوسری طرف ایک منفی اثر یہ بھی پڑا کہ اعلیٰ حضرت پر ہونے والے کام کا معیار پستی کا شکار ہو گیا- اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری، اعلیٰ حضرت کا عشق رسول، اعلیٰ حضرت کا ترجمۂ قرآن جیسے موضوعات پر ہزاروں مضامین لکھے گئے اور بیشتر مضامین میں ایک ہی بات کی تکرار کی جاتی رہی- رضویات پر لکھنا اور لکھوانا، چھپنا اور چھپوانا ایک فیشن بن گیا- نتیجہ یہ ہوا کہ رضویات پر مضامین رسائل و جرائد میں دیکھے جانے لگے اور ان کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی بجائے صرف مضمون دیکھ کر ہی دل کو تسکین پہنچائی جانے لگی-

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے رشحاتِ قلم کا بڑا حصہ فتووں پر مشتمل ہے- ڈاک کے ذریعے ان کے فتاویٰ لکھنے کے ساتھ ہی ملک کے طول و عرض میں پھیلتے رہے- پڑھے جاتے رہے اور اپنا اثر دکھاتے رہے- پھر مطبع اہل سنت بریلی (قیام ۱۳۱۳ھ) کے ذریعے اعلیٰ حضرت کے بعض کتب و رسائل ان کی زندگی ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہوئے اور بڑے پیمانے پر ان کی تقسیم ہوئی- تحفہ حنفیہ پٹنہ اور دبدبہ سکندری رام پور کے توسط سے بھی اعلیٰ حضرت کے افکار و تحقیقات ملک بھر میں پھیلتے رہے- اعلیٰ حضرت کے شاگرد مولانا ظفر الدین بہاری غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حیات اعلیٰ حضرت لکھ کر اعلیٰ حضرت کی حیات و خدمات کو مدون کیا- افسوس کہ اس کی مکمل اشاعت بیسویں صدی کے گزر جانے کے بعد ہی ممکن ہو سکی اور اشاعت ہوئی بھی تو اس طور پر کہ پاکستان کا نسخہ ہندوستانی نسخے سے مختلف ہے اور ہندوستانی نسخہ پاکستانی نسخہ سے مختلف ہے- دونوں نسخے ایک دوسرے کی بہ نسبت ناقص ہیں جس کی تصحیح نہایت ضروری ہے- مولانا ظفر الدین بہاری کے بعد اعلیٰ حضرت کے برادر زادے مولانا حسنین رضا بریلوی کا نام بھی اس خصوص میں قابل ذکر ہے کہ انہوں نے سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات لکھ کر راز دار خانہ ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ حضرت کی شخصیت کے بہت سے گمنام پہلوؤں کو اجاگر کیا- مولانا برہان الحق جبل پوری نے اکرام امام احمد رضا لکھا اور ایک شاگرد ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ حضرت کی شخصیت کے تعلق سے بہت سی قیمتی یادوں کو محفوظ کر دیا- مولانا بدر الدین احمد قادری گورکھ پوری کی کتاب سوانح اعلیٰ حضرت نے بھی اعلیٰ حضرت کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو عوام تک پہنچانے میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا- اس طرح کی اور کتابیں بھی لکھی گئیں اور ان سب کا انداز اور اسلوب روایتی تھا- اعلیٰ حضرت کے اصل علمی سرمایہ یعنی فتاویٰ رضویہ کی تدوین

واشاعت سنی دارالاشاعت مبارک پور کے ذریعے ہوئی- اس حوالے سے مولانا عبدالرؤف بلیاوی اور مفتی عبدالمنان اعظمی کا نام بہت ہی قابل احترام ہے، جنہوں نے تدوین کا یہ عظیم فریضہ انجام دیا-

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار و خیالات کی جدید علمی اسلوب میں اشاعت کے لیے مولانا محمد احمد مصباحی، صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اور ان کے رفقا مولانا لیٰسین اختر مصباحی، مولانا بدرالقادری، مولانا افتخار احمد مصباحی، مولانا عبدالمبین نعمانی وغیرہ نے ۱۹۷۶ء میں المجمع الاسلامی قائم کیا جہاں سے امام احمد رضا اور تصوف، امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات، امام احمد رضا کی فقہی بصیرت جیسی بلند پایہ کتابیں علمی انداز میں سامنے آئیں- اس کے ساتھ ترجمہ و تسہیل اور جدید پیراگرافنگ کے ساتھ اعلیٰ حضرت کے درجنوں رسائل خصوصاً جد الممتار حاشیہ رد المحتار پہلی بار اشاعت پذیر ہوئے- یہی کام اس سے قبل پاکستان میں حکیم موسیٰ امرتسری نے مرکزی مجلس رضا کے قیام (۱۹۶۸ء) اور ماہنامہ جہان رضا کی اشاعت اور اعلیٰ حضرت کی کتابوں اور اعلیٰ حضرت پر لکھی جانے والی کتابوں کی اشاعت و تقسیم کے ذریعے کیا-

۱۹۷۰ء میں پروفیسر مسعود احمد مجددی حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی تحریک پر مرکزی مجلس رضا کے پلیٹ فارم سے رضویات پر کام کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور رضویات پر نئے انداز سے کام کرنا شروع کیا- اعلیٰ حضرت کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر درجنوں اعلیٰ معیاری کتابیں لکھ کر علمی اور دانش ور طبقہ کو پہلی بار چونکا دیا اور سب کو رضویات کی طرف متوجہ کر دیا- پروفیسر مسعود کے علاوہ پاکستان میں مولانا عبد الحکیم شرف قادری، مفتی عبد القیوم ہزاروی، مولانا عبد الحکیم اختر شاہجہاں پوری، سید وجاہت رسول قادری (ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی) اور ہندوستان میں مولانا لیٰسین اختر مصباحی کا نام بہت نمایاں ہے جنہوں نے کمیت و کیفیت اور تنوع ہر لحاظ سے رضویات پر بڑا کام کیا- ہندوستان میں رضویات کی اشاعت کے حوالے سے الحاج سعید نوری اور رضا اکیڈمی اور مولانا عبد الستار ہمدانی اور مرکز اہل سنت برکات رضا کے نام بھی اس ضمن میں بہت اہم ہیں- ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں جن کا شمار نہ اس مختصر سی تحریر میں ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے- ان تمام کاموں میں سب سے ممتاز اور اہم کام فتاویٰ رضویہ کی جدید اشاعت تھی- چوں کہ فاضل بریلوی کی ہشت پہلو شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو فقہ وفتاویٰ کا ہے کیوں کہ بنیادی طور پر وہ ایک عالم اور مفتی تھے اور ان کا سب سے بڑا سرمایہ ان کے فتاویٰ تھے جو کچھ فتاویٰ رضویہ کے قدیم نسخے میں چھپے ہوئے تھے اور کچھ کتابوں اور رسالوں کی شکل میں مطبوع تھے اور کچھ منتظر اشاعت تھے - مفتی عبدالقیوم ہزاروی نے اس پورے علمی ذخیرے کو عربی اور فارسی عبارات کے ترجمے اور حوالوں کی تخریج کے ساتھ ایک ساتھ شائع کرنے کا عزم کیا، مختلف جلدوں پر مختلف ماہر علما کی خدمات لیں اور سب کی اجتماعی کاوش سے فتاویٰ رضویہ تیس ضخیم جلدوں میں چھپ کر پہلی بار سامنے آیا جس میں اعلیٰ حضرت کے تقریباً تمام دستیاب فتاویٰ یکجا ہوگئے ہیں- اس کام کو میں بنیادی اور کلیدی اس لیے قرار دیتا ہوں کہ کسی شخصیت کا اصل سرمایہ اس کی اپنی تحریریں ہوتی ہیں رہا اس شخصیت اور اس کے فن پر تحقیق کا معاملہ تو جب اصل سرمایہ موجود ہوگا تو ثانوی تحقیقی عمل تو ہوتا ہی رہے گا-

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر عصری دانش گاہوں میں علمی تحقیق کا سلسلہ بھی شروع ہوا- سب سے پہلے مولانا حسن رضا نے پٹنہ سے اعلیٰ حضرت کی فقہی خدمات پر پی ایچ ڈی کی- اس کے بعد اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری، اعلیٰ حضرت کے عشق رسول اور دوسرے موضوعات پر دنیا بھر کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم، فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے- کولمبیا یونیورسٹی امریکہ سے اوشا سانیال نے اعلیٰ حضرت کی شخصیت پر مقالہ لکھا جو انگریزی زبان میں چھپ کر آ گیا ہے- مولانا ممتاز احمد سدیدی نے جامعۃ الازہر سے اعلیٰ حضرت کی عربی شاعری پر مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی، مولانا صادق الاسلام نے پروفیسر اختر الواسع کی نگرانی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں اعلیٰ حضرت کی تحریک اور اس کے اسباب واثرات پر اپنا مقالہ لکھ کر جمع کر دیا ہے- اس طرح دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ حضرت کے فکر وفن پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں، جس سے جدید علمی طبقہ اعلیٰ حضرت کی شخصیت اور ان کے افکار سے متعارف ہوا اور متعارف ہو رہا ہے- لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہاں پھر دوبارہ یہ اظہار کرنا ضروری ہے کہ اعلیٰ حضرت کی عبقری شخصیت جتنی مستحق تھی اتنا کام اس پر اب تک نہیں ہو سکا- میری نظر میں چند امور ایسے ہیں جن پر توجہ دینے

اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) اب تک جدید اسلوب اور معیار کے مطابق فاضل بریلوی کی شخصیت پر ایک مستقل قاموسی سوانح نہیں لکھی جا سکی۔ پروفیسر مسعود احمد مجددی نے بھی بارہا اس کا اظہار فرمایا اور اپنی تحریروں میں کئی جگہ اسے لکھا بھی۔ انہوں نے باضابطہ ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا خاکہ بھی تیار کر لیا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام کو جلد از جلد تکمیل تک پہنچایا جائے۔ یہ گروپ ورک ہے۔ اس کے لیے محققین کی ایک ٹیم اور وافر سرمایے کی ضرورت ہے۔ رضویات کے غم میں دبلے ہونے والے کاش اس کام کی طرف متوجہ ہوتے!

(۲) اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر مختلف ویب سائٹس موجود ہیں لیکن اب تک کوئی ایسی ویب سائٹ نہیں بن سکی جس میں بیک وقت اردو، عربی، اور انگلش میں فاضل بریلوی کی شخصیت و سوانح پر مواد ہو۔ ان کی تمام کتابیں اور تمام فتاویٰ موجود ہوں۔ ان سے استفادہ کرنا اور ان کا مفت ڈاؤن لوڈ کیا جانا ممکن ہو۔ انٹرنیٹ جو علم کی تبلیغ اور معلومات کی ترسیل کی حیرت انگیز ایجاد کی شکل میں سامنے آیا ہے اس سے کما حقہ استفادہ نہ کرنا اور اس کے توسط سے اعلیٰ حضرت کے افکار و تحقیقات کی برقی ترسیل نہ کرنا جدید ذرائع سے ہماری ناواقفیت یا تساہلی یا فاضل بریلوی سے جھوٹے دعویٰ محبت کی دلیل ہے۔

(۳) مفتی عبد القیوم ہزاروی اور ان کے رفقا نے اپنی انتھک جدوجہد سے فتاویٰ رضویہ کی جدید اشاعت کر دی۔ رضویات کے باب میں اب تک کا یہ سب سے بڑا کام ہے۔ ان کے شائع کردہ پاکستانی نسخے کی ہندوستان سے بھی اشاعت ہو رہی ہے لیکن مختلف اہل علم نے بتایا کہ ترجمہ اور تحقیق و تخریج میں عجلت کے سبب بہت سی خامیاں راہ پا گئی ہیں۔ اس بات کو ایک حد تک میں نے بھی محسوس کیا۔ اب ضرورت ہے کہ ہند و پاک میں رضویات پر کام کرنے والا کوئی تحقیقی ادارہ یا اعلیٰ حضرت سے منسوب کوئی بڑی شخصیت یہ بیڑا اٹھائے۔ محققین کی ایک ٹیم کو تمام تر سہولیات فراہم کرے اور موجودہ ترجمہ و تحقیق اور تخریج پر نظر ثانی کر کے اسے فتاویٰ کی شایان شان بنائے پھر اس کی تصحیح کے بعد از سر نو اس کی اشاعت ہو اور موجودہ نسخے کی اشاعت ثانی موقوف کر دی جائے۔

(۴) فتاویٰ رضویہ کی جدید اشاعت کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو دنیا کے لیے فاضل بریلوی کے گنج ہائے گراں مایہ سے استفادہ آسان ہو گیا لیکن عالم عرب اب بھی ان سے محروم ہے۔ اگر فتاویٰ رضویہ کا زبان و ادب کے ماہرین کے ذریعے عربی ترجمہ ہو جاتا ہے تو عالم اسلام اس عالم ربانی کی تحقیقات و نوادرات سے پورے طور پر استفادہ کر سکتا جو اس کا حق ہے۔ یہ کام تاج الشریعہ علامہ اختر رضا خاں ازہری جو خود بھی عربی زبان پر نظر رکھتے ہیں، کی سرپرستی میں ہو جائے یا کوئی اور صاحب یا کوئی اور ادارہ اس کام کو اپنے ذمے میں لے لیں تو رضویات کا ایک بڑا کام ہو جائے گا۔ یہ کام بھی شخصی نہیں اجتماعی ہے۔ اس کے لیے بھی ماہرین کی ایک پوری ٹیم چاہیے جنہیں اعلیٰ وظائف دیے جائیں اور جدید سہولیات فراہم کی جائیں۔ اگر اس کے بعد یہ کام انگریزی میں بھی ہو جائے تو صرف عالم اسلام ہی نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کے لیے اعلیٰ حضرت کی تحقیقات سے استفادہ ممکن ہو جائے گا لیکن یہ کام بعد کے مرحلے کا ہے، عربی ترجمہ اس سے پہلے ضروری ہے۔

رضویات کے حوالے سے یہ چار بنیادی کام ہیں جو فاضل بریلوی کا دم بھرنے والوں کی توجہ کے طالب ہیں۔ کام کرنے کے یہ ہیں جن کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے اور جو کام نہیں ہے اس کو کام بنا کر رضا رضا کا شور مچایا جا رہا ہے۔ اب نمائشوں کی نہیں کام کی ضرورت ہے۔ حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز مراد آبادی کا قول ہے: ’’ہر مخالفت کا جواب کام ہے۔ کام کرو نام ہو ہی جائے گا۔‘‘ جو حضرات نمائش کو ہی اپنا کام بنائے ہوئے ہیں وہ یاد رکھیں کہ وقتی طور پر وہ چاہے جتنا خراج وصول کر لیں اور اعلیٰ حضرت کے نام پر چاہے جتنا کما لیں، تاریخ انہیں اپنے صفحات میں مثبت طور پر ہرگز جگہ نہیں دے گی۔ اس کے ساتھ میں اس بات کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت پر کام کرنا جو ایک فیشن سا بنتا جا رہا ہے، خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو کہ مصداق ہر کوئی اعلیٰ حضرت پر لکھنے کے لیے اور اعلیٰ حضرت کے نام پر اکیڈمی قائم کرنے کے لیے جو بے چین نظر آ رہا ہے اس رجحان کی حوصلہ شکنی کی ضرورت ہے۔ اس کا جو سب سے بڑا نقصان ہے وہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دین و ملت کے دوسرے ضروری موضوعات ہماری بے التفاتی کا شکار ہیں اور دین و دنیا کے جو دوسرے کام ہیں ان کو کرنے کے لیے کوئی کمربستہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ جن قوموں سے عقابی روح رخصت ہو جاتی ہے اور وہ بھیڑ کی چال چلنے کی عادی ہو جاتی ہیں وہ کبھی زندگی کی دوڑ میں سرخ رو نہیں ہو سکتیں۔ □□□

مولانا صغیر اختر مصباحی☆

مروجہ جلسے: ایک بے لاگ تجزیہ

کوئی دور تھا جب ذکر خیر کی مجلس ''محفل وعظ ونصیحت'' ہوا کرتی تھی جو اپنی افادیت ومعنویت کے لحاظ سے بہرحال انتہائی پرتاثیر ہوتی تھی- آج یہ محفلیں جلسہ، اجلاس اور کانفرنس کے نام سے موسوم ہوتی جارہی ہے اور جب لفظ کانفرنس بھی ہرخورد وکلاں کے ہاتھ لگ گیا تو ''ارباب حل وعقد نے'' اس عمل خیر کی ذرا سی نوعیت بدل کر سمپوزیم یا سیمینار جیسے طلسماتی ناموں سے جلسوں کی طرف سامعین کی توجہ مبذول کرانا شروع کردی ہے اور آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

ان ٹائٹلوں کی حقیقی حیثیت وپیوستگی سے قطع نظر یہ اجلاس جتنے مفید ہونا چاہئے تھے دکھتے نہیں- یقیناً عہد رفتہ کی ''محفل وعظ ونصیحت'' جتنی سودمند، نتیجہ خیز، سبق آموز اور بصیرت افروز ہوتی تھی دور حاضر تو کیا ماضی قریب بھی اس کی پہونچ کو نہیں پہونچتا- آج وہ نیک نیتی، خیر خواہی، ذوق نصیحت، خلوص عمل اور بے لوث جذبات کہاں سے آئیں جو ان محفلوں کے اصل محرک اور آلۂ کار ہوا کرتے تھے، بھاری بھرکم نذرانوں کی طلب یا چمک نے خلوص کار افراد کے جذبۂ خیرسگالی کو بھی بے حد متاثر کردیا ہے، اب مخلصوں کے بھی ناز نخرے بڑے حوصلہ شکن اور روح فرسا ہوتے جارہے ہیں-

میدان خطابت کا نقشہ یک لخت الٹا ہوا نظر آرہا ہے، مقررین کا کام شعلہ بارانہ خطاب فرماکر مجمع سے اچھل کود کی داد وصول کرنا ہے، رہے خطاب کے پیچ وخم تو اس کیلیے مقامی علماء مہینوں تک مناسب یا غیر مناسب توجیہ کرتے رہیں- ہاں مقامی علماء کو یہ بھی جواب دینا ہے کہ خطیب ہندوستان نے عشاء کی نماز کیوں نہیں پڑھی؟ فجر کے وقت کیوں سوتے رہ گئے؟ طرفہ تماشہ یہ بھی ہے کہ بعض بعض کی جسارت تو یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ بڑی طمطراقی سے فرمادیتے ہیں کہ تقریر کرنے بلایا ہے یا نماز پڑھنے؟ مگر ان غافلوں کو یہ احساس ہرگز نہیں کہ تقریر کی گذارش یا حکم تو منتظمین کی طرف سے ہے اور نماز کا حکم احکم الحاکمین کی طرف سے......! ذرا غور کریں کہ اس جملہ نے آں جناب کو کہاں پہنچا دیا؟

بے عملی کے ساتھ بدعملی بھی در آئی ہے کہیں چور دروازے سے اور کہیں صدر دروازے سے، بعض ''علامہ'' بڑی بے باکی سے عین کو غین کرنے کی کوشش میں لگے ہیں جو ایک عام انسان کیلیے بھی سنگین جرم ہے ''علامہ'' تو پھر علامہ ہیں- (العیاذ باللہ)

اسی طرح نعت خوانی جو ایک عافیت بخش، عاقبت افروز اور خالص عقیدت مندانہ عمل ہے دور حاضر میں اس کی وہ آن بان نہیں رہی، نعت خوانوں کی شرمناک وناز نین ادائیں اور رقصانہ طرز خواندگی رونق بازار (اجلاس) ہوکر رہ گئی ہیں جس سے نعت خوانی کی روحانیت اور فطری کیفیت مجروح ہوچکی ہے-

ایک جلسہ میں ایک شاعر اعظم کے بارے میں انتظامیہ کے بعض افراد سے سنا گیا کہ جس وقت سے تشریف لائے ہیں اپنے موبائل میں مصروف ہیں اور موبائل کی مصروفیت کوئی اور نہیں بس موبائل گیمس سے غایت درجہ دلچسپی نے سکون وآرام غارت کر رکھا ہے میں اس کی تصدیق کے لیے اسٹیج پر ان کے جوار میں بیٹھا، میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے، میری یہ مخلصانہ پیشکش بڑی ناگواری سے قبول فرمائی اور پھر سے اپنے سابقہ عمل میں مصروف ہوگئے- حد تو یہ کہ نعت پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے اور اپنی باری نبٹانے کے بعد بیٹھتے ہی موبائل میں لگ گئے- جی میں بہت کچھ آیا مگر ہمت جی کا ساتھ نہیں دے سکی- بعد میں معلوم ہوا کہ شاعر صاحب سترہ ہزار میں آئے تھے- وہ تو کہئے کہ خیر سے انتظامیہ کو چندہ فراہمی کا انتہائی شوق ہے ورنہ اس طرح کی حرکتیں مارکیٹ ڈاؤن کردیتیں-

اگرچہ جلسوں کا مقصد اصلی نعت خوانی وتقریر ہوتا ہے مگر جہاں تک میری نظر کام کررہی ہے جلسہ کے مندرجہ ذیل پانچ اجزائے ترکیبیہ ہوتے ہیں-

(۱) تلاوت (۲) نعت (۳) تقریر (۴) سلام (۵) دعا- میں سلسلہ وار ہر ایک پر گفتگو کرنا مناسب سمجھتا ہوں-

تلاوت: مقصد، افادیت اور رواج:- محفل کا آغاز تلاوت کلام

☆Jamia Nooria Razvia, Baqar Ganj, Bareilly(U.P)

پاک سے اس لیے کیا جاتا ہے کہ تلاوت کی برکتوں سے ماحول میں روحانیت آئے، نور و رحمت کی برسات ہو اور محفل کا انجام بخیر ہو مگر اس مہتم بالشان کار خیر و عملِ سعادت کی اہمیت کو سراسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، تلاوت ہوتی رہتی ہے اور آداب تلاوت پامال ہوتے رہتے ہیں۔ جبکہ سچائی یہی ہے کہ قاری اور تالی کی نیت جو بھی ہو کم از کم سننے والوں کو تلاوت کے آداب ملحوظ رکھنا ہی چاہیے۔

جہاں تک تلاوت کلام پاک کا سوال ہے ہمیں ہمہ تن گوش ہو کر سننے کا حکم ہے حتیٰ کہ اسم جلالت سن کر کلمۂ جلالت اور اسم رسالت سن کر صیغۂ درود و سلام پڑھنے کی بھی گنجائش نہیں ہے، اسی طرح دوران تلاوت سبحان اللہ و ماشاء اللہ کی سرمدی صدائیں تو درکنار سرگوشیوں کی بھی اجازت نہیں ہے پھر کسی شیخ طریقت، خطیب ہندوستان یا شاعر اعظم کی آمد پر پرجوش استقبال چہ معنی دارد؟

لطیفہ: سنا تھا کہ فلاں بزرگ تقویٰ شعار، عفت مآب اور شریعت شناس ہیں قرب و صحبت نہ ہونے کی وجہ سے تجربہ نہیں تھا مگر ایک چشم دید واقعہ نے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" مقولہ سچ کر دکھایا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہاں کے عرس کی تقریب میں راقم السطور بھی حاضر ہوا، رات کا سہانا سماں تھا، جلسہ اپنے ابتدائی مراحل سے گذر چکا تھا، شیخ طریقت کی آمد کے بعد باقاعدہ اجلاس کا آغاز ہوا، بڑی روح پرور اور کیفیت آور تلاوت ہو رہی تھی، مجمع پر پُر شوق خاموشی چھائی ہوئی تھی، اچانک شیخ طریقت نے تھوڑے فاصلے پر تشریف فرما فرزند گرامی کو بلایا، محترم گئے اور دیر تک دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی جب کہ تلاوت اسی آن بان کے ساتھ چلتی رہی، اس حادثہ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ (ممکن ہے کہ بعض دیگر افراد بھی میری طرح دوچار ہوئے ہوں) خیر سے تلاوت ختم ہوئی فرزند گرامی نے پُر مسرت انداز میں مائک سنبھالا اور یوں اعلان ارشاد فرمایا: سبحان اللہ والد گرامی (ایک مخصوص لقب کے ساتھ) کی خواہش ہے کہ وہ ان تلاوت کردہ آیات کی تفسیر فرمائیں گے، لہٰذا میں گذارش کرتا ہوں کہ......

اعلان ہوتے ہی مجمع سے پُر جوش نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے پھر اس کے بعد حضرت نے وہ تفسیر بیان فرمائی جسے تمام تر عقیدت و رعایت کے باوجود محترم صاحبزادے بھی تفسیر کا نام نہیں دے سکتے۔

خیر یہ تو ایک شیخ طریقت کی بات تھی، دوران تلاوت اس طرح کی واردات ایک عام بات ہوگئی ہے، کیا عوام کیا خواص؟ اس تعلق سے میں یہی کہوں گا کہ دوران تلاوت "واذا قرئ القران الخ" کے لازمی تقاضوں کو پورا کرنا ملت کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے اس کے لیے عوام سے زیادہ علماء اور علماء میں بھی بزرگ علماء کہیں زیادہ ذمہ دار ہیں، اللہ رب العزت حال بحال رکھے (آمین)

نعت: مقصد، افادیت اور رواج:۔ ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ نعت خوانی ایک عافیت بخش، عاقبت افروز اور خالص مخلصانہ عمل ہے البتہ موجودہ دور میں اس کی یہ معنوی حیثیت کس حد تک یافت یا دریافت ہے زیر بحث ہے ایسی محفلیں کم ہیں جن میں اس واقعیت کا بھرم رکھا جاتا ہے ورنہ حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔

اولاً تو زینت ممبر شعراء میں ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی ہے جنہیں شاعری چھو کر نہیں گذری مگر ہیں "شاعر اسلام"! خیر ہمیں اس سے بحث اس لیے بھی نہیں ہے کہ جلسوں کو نعت خوانوں کی تلاش ہوتی ہے خیر سے نعت خواں نعت گو بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہے البتہ مقطع چھوڑ کر یا جسارت کرتے ہوئے مقطع میں اپنا تخلص جڑ کر پڑھنا دیانت کے خلاف ہے۔

ان شاعروں سے کہیں زیادہ افسوس ناک ان کی "دریافت" ہے جو جلسوں کی زینت تو کم ان کے ہم رتبہ سامعین کیلیے "سامان طرب" زیادہ ہوتی ہے۔ ہمیں کلام کی فنی، علمی اور لسانی حیثیت پر اس لیے تبصرہ نہیں کرنا ہے کہ عوام کے سامنے اس طرح کا کلام ہی مقبول ہوتا ہے اسلیے کہ جن سے داد اور کھاد لینا ہے ان کے مبلغ علم کی رعایت ایک "دانشمندانہ اقدام" ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس "دانشمندانہ اقدام" سے دانشمند کے "مبلغ لیاقت" کا بھرم کھل جاتا ہے۔ یہاں یہ عذر بھی نہیں کیا جا سکتا عوام کا مزاج ہی یہی ہے، اس لیے کہ شاعروں کو تمام تر ناز و ادا کے ساتھ سر کا تاج بنا کر لانے والوں سے اس عزت افزائی کا فائدہ اٹھا کر کوئی بھی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

مروجہ نعت گوئی میں ضمناً حمد خوانی بھی شامل ہے اور التزاماً منقبت خوانی بھی۔ البتہ حمد خوانی کم یاب ہے جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے اور منقبت خوانی کی کثرت نے خود نعت خوانی کو بھی متاثر کر دیا ہے۔

شعری پیکر میں بزرگوں کا ذکر منقبت کہلاتا ہے، ہماری فطرت و عقیدت کا عین تقاضا ہے کہ منقبت کے ورد سے ہماری زبان تر و تازہ

رہے مگر نعت پاک میں منقبت کی اس طرح آمیزش کہ نعت پر منقبت غالب آجائے نعتیہ آداب کی ان دیکھی ہے- میرا خود مشاہدہ ہے کہ بعض محفلوں میں نعت کے مقابلہ میں منقبت زیادہ مقبول ہوتی ہے جو یقیناً مقام عبرت ہے اور اس سے بڑھ کر مقام عبرت یہ ہے کہ کبھی اسلاف کے بالمقابل اخلاف کی منقبت اور مرحومین کے بالمقابل موجودین کی منقبت مقبول تر ہوجاتی ہے خصوصا خانقاہی مشاعرے یا جلسے اس کی زندہ وجاوید مثال ہیں-

تقریر: مقصد، افادیت اور رواج:- وعظ و نصیحت جو اب ''تقریر'' ہوکر رہ گئی ہے اس کا اہم اور خاص مقصد تھا کہ معصیت کی آلائشوں میں مبتلا انسانیت کو صحیح سمت دکھا کر تزکیۂ نفس، طہارت فکر اور محاسبۂ ذات کیلیے ہموار و سازگار کیا جائے تاکہ انسانی ذہن و دماغ پر چھائے غفلت کے دبیز پردے اٹھ جائیں اور حقیقۃً عبد اپنے معبود حقیقی سے قریب ہوجائے-

دل فطرتاً رقیق ہوتا ہے، صحیح سمت کی رہنمائی دل کو کسی حد تک متاثر ضرور کرتی ہے مگر صحیح سمت کی رہنمائی یا تو ہوتی نہیں ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو انداز رہنمائی موثر نہیں ہوتا - رہنما یا رہنمائی کی کمزوریاں اس خاص مقصد کو بروئے کار لانے میں ایک حد تک رکاوٹ بن جاتی ہیں جس کا تدارک وقت کی اہم ضرورت ہے-

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اب وعظ ونصیحت سے کہیں زیادہ تقریر بیانی بلکہ تقریر خوانی چل رہی ہے، گا گا کر تقریر پڑھی جاتی ہے، موضوع کا تعین ہی نہیں اور اگر موضوع متعین کر دیا جائے تو اس پر خاطر خواہ عمل نہیں ہے ''محنتانہ'' وصول کرنے کیلیے کچھ ایسی جدو جہد جاری رہتی ہے جو مفید کم اور غیر مفید زیادہ ہوتی ہے- خواہ مخواہ تقریر کو طول دیا جاتا ہے گویا وقت گھسیٹا جا رہا ہے- جبری زور بیان فطرت پر گراں گزرتا ہے جو بات نرم اور شائستہ انداز میں دو پانچ منٹ میں کہی جاسکتی ہے اس کو مکررات وقافیہ پیمائی کے ذریعہ تطویل لاطائل کر دیا جاتا ہے اور یہ ٹٹولنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ضرورت کیا ہے اور اس ضرورت کی مناسب ومفید تکمیل کس طرح ممکن ہے؟ میدان خطابت میں کچھ ایسے شہسوار بھی ہیں جو گونا گوں صلاحیت رکھتے ہیں اور اگر ذرا سی دل چسپی سے کام لیں تو اپنی خداداد صلاحیت سے اصلاح و فلاح کے اہم پہلو بیان کر سکتے ہیں مگر ''سامان تجارت'' جب یونہی بک رہا ہے تو ڈھیلے کی ضرورت کیا ہے؟

جلسوں میں ایک عجیب رسم یہ بھی در آئی ہے کہ بعض تسبیحی وتہلیلی کلمات مثلاً سبحان اللہ وغیرہ کو محض تجمیعی کلمات بنا کر رکھ دیا گیا ہے، ان کلمات کے واقعی فضائل گنائے جاتے ہیں، ان کلمات کی افادیت و برکت یقیناً مسلم ہے مگر شاعر یا مقرر کی اس مقصد خیر کے پس پردہ پسینجر کو ایکسپریس بلکہ سپر فاسٹ بنانے کی پر شوق کوشش ہوتی ہے ،آں جناب نے خود کو اتنا متاثر کر رکھا ہے کہ اس کے بغیر دو قدم چلنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے ہاں اگر کوئی دوسرا مائک پر کام سے لگا ہو تو ان ''فضائل شماروں'' کو اس ثواب وبرکت کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی - اب وہ اس طرح محو گفتگو ہو جاتے ہیں گویا وہ ابھی بھی منصب خطابت پر ہیں-

نذرانوں کی تہہ بازاری یا ان کی جبریہ تحصیل کے تعلق سے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسی بھی عالم کا منصبی اور ملی فریضہ ہے اور اس کی انجام دہی کے لیے اسے اپنے ہی کاندھوں کا بوجھ بننا تھا یہ تو اس کے لیے زرین موقعہ ہے کہ قوم نے اس کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے مگر اس بار برداری کے ''قصور واروں'' سے ساری شرافتوں کو داؤ پر لگا کر مزدوری سے زیادہ دبنگ انداز میں نذرانے وصول کئے جاتے ہیں جو غیر ذوی العقول کے لیے بھی مقام عبرت ہے-

سلام: مقصد، افادیت اور رواج:- صلوٰۃ وسلام وہ عمل خیر ہے جس کی لازوال برکتیں بندہ کو ابدی سعادت اور دائمی فیروز بختی کی ضمانت دیتی ہیں، اس کے استحسان وشوق مندی کا انداز اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ خود باری تعالیٰ کی سنت ہے، اس کے سراپا عصمت فرشتے بھی اس کا اہتمام کرتے ہیں اور ایمان ویقین کی دولت سے سرفراز خوش نصیبوں کو اس عمل خیر کی بجا آوری کی تاکید ہے-

درود وسلام کے فضائل ومناقب پر دفتر کے دفتر تحریر کیے جا چکے ہیں، اس کی فضیلت پر بولنے کا موقعہ ہو تو گھنٹوں تک زبان چلتی رہے اور تھکنے کا ذرا بھی نام نہ لے مگر جب کسی اجلاس میں سلام پڑھنے کا وقت ہو تو یہ اختتام اجلاس کا علامتی نشان بن کے رہ جاتا ہے- اس موقعہ سے بڑے بڑے اچھوں کو بھی صرف دو تین اشعار پڑھنے کی تاکید کرتے دیکھا گیا ہے اور اگر خوش قسمتی سے کچھ زائد اشعار پڑھ دیے گئے تو پُر غضب چہرہ کے نشیب وفراز دیدنی ہوتے ہیں- مجھے یہ پوچھنے کا حق

ہے کہ اگر درود وسلام واقعی فضیلت و برکت کا آبشار ہے اور یقیناً ہے تو پھر اس بے توجہی و بے نیازی کا مطلب؟

عقیدت و محبت رسول ﷺ کا تقاضا ہے کہ کم از کم قدر معتد بہ اشعار تو پڑھے جانا چاہیے یا یہاں بھی رسم و رواج ہی کا بول بالا رہے گا -اس سے تو بہتر تھا کہ آسمان خطابت کے درخشندہ ستارے اور چمنستان نعت ومنقبت کے طائران خوش الحان ذرا کچھ کم وقت صرف کرتے کہ اس لاہوتی عمل کو تو مقام واقعی مل جاتا- خیر دعا فرمائیں کہ ہماری محفلیں اس لطف وسعادت سے باقاعدہ بہرہ مند ہوتی رہیں (آمین)

دعا: مقصد، افادیت اور رواج:- دعا عبادتوں کا مغز ہے، دعا کے لیے پرشوق اہتمام ہونا چاہیے، لہٰذا مناسب ہے کہ اپنی ناہموار زندگی کے نشیب وفراز ذہن ودماغ میں حاضر رکھیں اور کارساز حقیقی کی قہاری وغفاری کے احساسات جاگتے رہیں، سراپا خاکساری کا نمونہ بن کر خود کو اس بارگاہ عظمت وجلال میں حاضر جانئے اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ باب رحمت پر دستک دیجیے گویا ایک سنگین مجرم اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی خود سپردگی کا اعلان کر چکا ہے-

اس بارگاہ میں خود کو جتنا ہو سکے شرمسار کر لیجیے، دل پر انکساری کی ایسی کیفیت طاری کر لیجیے کہ چشم بے باک سے از خود اشک ندامت چھلک اٹھیں اور اس بے نیاز کے سامنے اپنی نیازمندی کا بھرپور ثبوت پیش کرتے ہوئے دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کے لیے دست دعا دراز کر دیجیے،، اپنا، اپنی قوم وملت اور اپنے ملک کا درد والم بیان کیجیے- مجھے یقین ہے کہ ابھی پورے طور پر اپنی بات ختم بھی نہ ہوگی کہ رحمت حق اپنی شان کریمی کا بے انتہا مظاہرہ فرما دے گی، کرم کے بادل چھائیں گے اور گوہر مراد سے دست طلب بھر جائے گا-

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ضرورت جتنی زیادہ شدید ہوتی ہے ضرورت مندوں کے چہرہ پر اتنے ہی زیادہ زبردست تاثرات ہوتے ہیں اور اس کی طلب کیلیے ویسا ہی اہتمام بھی کرتا ہے- خوش حالوں کو کوئی دیگر ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی رحمت الٰہی اور کرم خداوندی کی ضرورت تو بہر حال ہوتی ہی ہے اس لیے ان محفلوں میں کوئی سازگار ماحول برپا کرنا مشکل تو ہو سکتا ہے مگر ناممکن نہیں- میرے خیال میں کچھ نہ کچھ ماحول تو بہر حال برپا کیا جا سکتا ہے مگر زہے افسوس! دعائے خیر کا یہ خوش گوار موقعہ بھی بے توجہی اور عدم دل چسپی کی نذر ہو جاتا ہے- نہ کوئی شوق واہتمام اور نہ کوئی باقاعدگی- ایک رسم تھی جو کسی حد تک نبھالی گئی، البتہ بعض موقعوں پر اس رسم کا اہتمام دعا کو "شب ہجراں" سے زیادہ طویل کر دیتا ہے- باری باری ہر بڑی شخصیت کی شکایت مٹانے کی کوشش اٹھے ہاتھوں کو تھکا دیتی ہے اور انجام یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ناعاقبت اندیشی دعا کو ادھورا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے-

اخیر میں نقیب و ناظم حضرات سے میں معذرت خواہ ہوں کہ چاہتے ہوئے بھی ان کی ظریفانہ و بے باکانہ کارگزاریوں پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے اور میری کاہلی نے مجھے اتنا مصروف کر دیا ہے کہ فی الوقت بھرپائی مشکل ہے ہاں سخت دعا کی ضرورت ہے کہ خدائے پاک میرے بوجھل کاندھوں سے کاہلی کا بوجھ اتار کر فکر وقلم کو عام ہونے کی سعادت عطا فرمائے- (آمین) □□□

بقیہ: ہم نے دیکھا پاکستان

۹/دسمبر: یہ پندرہ دن پلک جھپکتے میں گزر گئے، ان میں ریکارڈنگ بھی ہوئی، علمی مذاکرے بھی ہوئے، کتابوں سے استفادہ بھی ہوا، اہل علم سے ملاقاتیں بھی ہوئیں، اور پیٹ بھر کے سیر وتفریح بھی ہوئی- سبھی لوگوں کی طرف سے ہمیں پذیرائی اور محبتیں ملیں جو یاد رہیں گی مگر سید صبیح الدین صبیح رحمانی نے جس خلوص ومحبت کے ساتھ دوستی نبھائی ہے اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ہے، میں شکریہ کے چھوٹے سے لفظ کے ذریعے صبیح کے آبگینہ محبت کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا-

روانگی کے وقت ایک مسئلہ سامان کے وزن کا کھڑا ہو گیا، ایک آدمی کو ۲۰ رکلو وزن لے جانے کی اجازت تھی، مگر ہمارے سامان کا مجموعی وزن تقریباً ۹۰ رکلو ہو رہا تھا، ظاہر ہے کہ "چار پائے برو کتابے چند" کی طرح یہ سارا وزن کتابوں کا تھا، اس مسئلہ کو برادرم فرید اقبال قادری نے حل کروایا کہ وہ P.I.A میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں ان کی وجہ سے وزن کا مسئلہ حل ہوا، کچھ اعزہ اور احباب سلسلہ الوداع کہنے کے لیے ائرپورٹ تک آئے، ہم نے جہاز میں بیٹھ کر اس مصرع کے ساتھ سرزمین پاک کو الوداعی سلام کیا-

□□□

ڈاکٹر مفتی مکرم احمد مجددی ☆

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد مجددی: کچھ یادیں کچھ باتیں

پروفیسر مسعود احمد مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ماہنامہ ''جام نور'' کے اکتوبر ۲۰۱۰ء اور نومبر ۲۰۱۰ء کے شماروں میں ''مشاہیر اہلِ سنت کی یادوں کے سلسلہ'' کے ضمن میں ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی کا دو قسطوں میں مضمون پڑھنے کا موقع ملا- ڈاکٹر صاحب نے حضرت پروفیسر صاحب کے بعض محاسن ومحامد کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین- اسی ضمن میں یہاں میں کچھ ان کی یادیں مختصر طور پر لکھ رہا ہوں-

یقیناً پروفیسر مسعود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے معاصر علما ومشائخ میں بے نظیر و بے مثال شخصیت کے حامل تھے- وہ نورانی شخصیت اور وجاہت جلیلہ کے ساتھ متصف تھے- وہ عالم دین، عارف باللہ اور زاہد باعمل تھے- وہ صاحب کرامت وشیخ وقت تھے- ان کے عالی کردار اور بلند اخلاق کے سب قائل تھے، تواضع وانکساری کا وہ مجسم پیکر تھے- محفلوں میں اسٹیج پر نمایاں طور پر وہ بیٹھنے سے ہمیشہ پرہیز فرماتے تھے، احیائے سنت سنیہ اور ترویج شریعت ان کا مشن تھا- علمائے اہل سنت اور مشائخ کرام ودانشوران قوم وملت کی عزت افزائی اور احترام کرنے میں وہ خوشی محسوس کرتے تھے، محبت سے پیش آنا اور ہر اک سے بڑھ کر ملنا ان کا طرۂ امتیاز تھا، کبر ونخوت، خود پسندی اور خود نمائی سے دور رہتے تھے- گھر پر آنے والے علما ومشائخ کا اپنے گھر کے دو زینوں سے اتر کر والہانہ جوش وخروش کے ساتھ استقبال فرماتے تھے- خوشی کی تقریبات ہوں یا تعزیتی مجالس، علمی کانفرنسیں ہوں یا ادبی سیمینار، عید میلاد النبی ﷺ کی محفلیں ہوں یا عرس شریف کے اجتماعات، سب میں بہ نفس نفیس تشریف لے جاتے تھے- نیک مجالس میں شرکت کرنے کے لیے استخارہ کا سہارا کبھی نہیں لیتے تھے- ان کا کردار اپنے اسلاف کے نقش قدم کے مطابق تھا، ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قابل تقلید تھا، اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے اور رحمت کاملہ کے ساتھ ان سے رحم وکرم کا معاملہ فرمائے، ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے- (آمین)

۱۹۹۱ء میں حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے عرس شریف کی مناسبت سے امام احمد رضا انٹرنیشنل کانفرنس میں ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا (کراچی) کی دعوت پر ہندوستان کے نامور علمائے کرام کے ساتھ کراچی جانا ہوا تھا- رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ، علامہ یٰسین اختر مصباحی، پروفیسر غلام یحییٰ انجم، پروفیسر محمود حسین، وغیرہ بھی ساتھ تھے- ماشاء اللہ یہ پروگرام بہت شاندار رہا، کچھوچھہ شریف سے حضرت سرکار کلاں بھی تشریف لے گئے تھے، ان تقریبات میں پروفیسر مسعود احمد صاحب سے طویل ملاقاتیں رہیں، انہوں نے اصرار کر کے مہمان علما کو اور اراکین ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کو ظہرانہ کی دعوت پر اپنے دولت خانہ پر بلایا تھا- حضرت صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری، حضرت پروفیسر مجید اللہ قادری، حضرت پروفیسر عبد الباری وغیرہ پیش پیش تھے- کتنی پر تکلف دعوت تھی، کتنا حسین انتظام تھا، کیسی بارونق خواص کی محفل تھی، بیچ بیچ میں مسکراہٹیں اور مختصر قہقہے اس محفل کی رونق کو بڑھا رہے تھے- الفاظ میں ان روح پرور مناظر کا بیان کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے- خاص بات یہ تھی کہ پروفیسر صاحب خود میزبانی میں مستعد تھے- آپ کے مریدین اور صاحبزادہ گرامی قدر سب مہمانوں کی خاطر میں خوش وخرم نظر آ رہے تھے- حضرت امین ملت پروفیسر امین میاں صاحب مدظلہ بھی ایک مرتبہ اپنے والد محترم صاحب سجادہ علیہ الرحمہ کے ساتھ کراچی تشریف لے گئے تھے- ایک محفل میں پروفیسر صاحب کی محبت اور استقبال کا ذکر فرما رہے تھے، علما کی تو بات ہی اور ہے وہ تو سب سے محبت فرماتے تھے اور سب کی عزت افزائی وخاطر تواضع فرماتے تھے، ورنہ آج علما ومشائخ کے ہاں اس انداز کی میزبانی کم ہی نظر آتی ہے-

پروفیسر صاحب علم وادب کے دل دادہ تھے- آقائے دو جہاں ﷺ کے عشق میں اور سنتوں کی پیروی میں ممتاز مقام کے حامل تھے- وہ اولیاء اللہ کے گرویدہ تھے- سیرت طیبہ، صحابہ کرام، علم ومعرفت، اسلامی تاریخ، تصوف، اولیاء اللہ کے کمالات، تاریخ وتمدن، اصلاحی مضامین،

سوانح اور تراجم تقریباً ہر اہم موضوع پر ان کی اہم تصنیفات وتالیفات موجود ہیں- مسلک اہل سنت کی ترویج میں انہوں نے نئے نئے انداز سے لکھا، ان کے قلم میں اللہ تعالیٰ نے وہ صفت عطا فرمائی ہے کہ ان کی تحریریں دل پر اثر انداز ہوتی ہیں، ان کا اسلوب اچھوتا اور نرالا ہوتا ہے، ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد کی کارفرمائی مکمل نظر آتی ہے- انہوں نے کثیر تعداد میں تحقیقی مقالات لکھے جو پاکستان میں کئی انسائیکلوپیڈیا میں شامل کیے گئے- قرآنی تراجم وتفاسیر کے موضوع پر انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے مفصل مقالہ لکھا جس پر انہیں سندھ یونیورسٹی سے ڈگری ایوارڈ ہوئی- انہیں پاکستان کا عظیم ترین خطاب اعزاز فضیلت عطا کیا گیا اور کئی گولڈ میڈل بھی دیے گئے- حضرت مجدد برحق شیخ احمد سرہندی فاروقی مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ اور نقش بندی سلسلہ کے معارف میں ان کی کئی تالیفات ہیں- اسی سلسلہ میں چودہ ضخیم مجلدات پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا ''جہان امام ربانی'' ان کی نگرانی میں امام ربانی فاؤنڈیشن کی طرف سے شائع ہوا- حضرت امام اہل سنت فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی حیات، علمی مقام وعظمت پر انہوں نے تحقیقی مقالات لکھے جن کی پذیرائی عالم اسلام میں ہوئی اور ہو رہی ہے، جن سے جامعہ ازہر کی فکر ہی بدل گئی- اعلیٰ حضرت سے متعلق کتب جب زرسمہار او سابق وزیر اعظم نے پڑھیں تو ان کے دل میں بریلی شریف کی عظمت قائم ہوئی- ان کی عظیم الشان علمی خدمات کے صلے میں ماہر رضویات، ماہر مجددیات اور مجدد العصر کے القاب سے علما ومشائخ نے انہیں یاد کیا- ان کی کتب کے تراجم عالمی زبانوں میں شائع ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں، یہ مقبولیت اور عظمت بھی انہیں من جانب اللہ حاصل ہوئی جس میں وہ دوسروں سے ممتاز ہیں-

پروفیسر مسعود احمد کی حیات کی ہمہ جہات قابلِ تقلید ہیں، جنہوں نے ان سے ملاقات کی ہے وہ اس کی سچائی سے واقف ہیں ان کے شاگردوں کو ان پر فخر ہے بلکہ ان کے اساتذہ بھی ان پر فخر فرماتے تھے، ان کی زندگی میں ان کی حیات وخدمات پر تحقیقی وعلمی مقالے ایم فل کے لیے اور پی ایچ ڈی کے لیے پاکستان میں لکھے گئے- اسی سلسلے کی ایک کڑی مولانا ڈاکٹر اعجاز انجم لطیفی صاحب استاذ جامعہ منظر اسلام بریلی شریف کا پی ایچ ڈی مقالہ ہے، جس کا عنوان ہے ''پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد حیات، علمی وادبی خدمات'' یہ مقالہ پروفیسر فاروق احمد صدیقی کی نگرانی میں بہار یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں لکھا گیا تھا، جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ ہوئی- یہ مقالہ شائع ہو کر تقریباً نوسواٹھائیس (۹۲۸) صفحات پر مشتمل ہے، جسے ضیاء الاسلام پبلی کیشنز، ضیا منزل (شوگن منشن آف محمد بن قاسم روڈ) عیدگاہ، کراچی (سندھ پاکستان) نے ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء میں شائع کیا ہے- اس مقالہ میں ڈاکٹر محمد حسین، صدر شعبہ عربی وفارسی، بریلی کالج، ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی اور دیگر محققین، علما، فضلا ومشائخ کے تاثرات بھی شامل ہیں، یہ مقالہ تو ۱۹۹۷ء میں قلم بند کیا گیا تھا اس کے بعد اپریل ۲۰۰۸ء تک پروفیسر صاحب نے علمی وادبی خدمات میں بہت سے قابل قدر اضافے کیے ہیں جو اس میں شامل نہیں ہیں- (یہ مقالہ میرے پاس موجود ہے) یہ فضیلت کیا کسی کو حاصل ہوئی ہے، جو انہیں پروردگار نے عطا فرمائی کہ زندگی میں ان کی زندگی پر متعدد علمی اداروں میں ان کی خدمات پر ریسرچ ہوئی، پروفیسر صاحب کی خدمات کی تفصیل ان کی ویب سائٹ المظہر ڈاٹ کام کراچی سے حاصل کی جا سکتی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے دین کی بے لوث خدمت کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں ان کے نام کو فضیلت عطا فرمائی-

پروفیسر صاحب بے نیازی رکھتے تھے، ایک مرتبہ ان کے گھر میں چوری ہوگئی، قیمتی سامان اور سونے کے میڈل وغیرہ چور لے گیا، لیکن پروفیسر صاحب کو ذرا بھی صدمہ نہیں ہوا، فرمانے لگے ان سب چیزوں کی مجھے تو ضرورت نہیں تھی، جسے ضرورت ہوگی وہ لے گیا، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ان چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری سے سبک دوش کر دیا، زندگی میں ایک ایک کرکے چیزیں ساتھ چھوڑتی جاتی ہیں یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ دنیا فانی ہے ایک دن تمہیں بھی جانا ہے، نادان انسان ان چیزوں کے چھوٹنے پر افسوس کرتا ہے اور اپنی آخرت کے لیے تیاریوں سے غافل ہو جاتا ہے- کبھی کبھی میں ان سے عرض کرتا تھا تو فرماتے تھے کہ میں یہ سب کام صلے کے لیے نہیں کرتا، مجھے کسی سے کوئی صلہ یا بدلہ نہیں چاہیے، جیسا جو کرتا ہے آپ اس کے حال پر چھوڑ دیجیے، اگر ہم ان باتوں کی طرف توجہ دیں گے تو پھر کام کیسے کریں گے؟ آپ بھی ایسی باتوں کی طرف توجہ نہ کیا کریں، بس اللہ تبارک وتعالیٰ قبول فرمائے یہی تمنا ہے-

انہیں خصوصیات کی وجہ سے ان کے مخلصین کا حلقہ بہت وسیع تھا، ہندوستان میں خانوادہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ اور خانوادۂ مارہرہ شریف

کے علاوہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے اساتذہ کرام، محترم مولانا یٰسین اختر مصباحی، محترم مولانا محمد احمد مصباحی، محترم مولانا افتخار احمد قادری، محترم سعید نوری، محترم مولانا غلام جابر شمس مصباحی، محترم ڈاکٹر مولانا اعجاز انجم لطیفی، جناب عبدالنعیم عزیزی، محترم پروفیسر غلام یحییٰ انجم، پروفیسر محمود حسین، دہلی میں ٹیا محل کے سبھی اشاعتی ادارے ان سے بخوبی واقف تھے، وہ جب ہندوستان تشریف لاتے تھے ہر ایک سے خود جا کر ملتے تھے اور اپنے پاس آنے والوں کی قدر فرماتے تھے، اسی طرح پاکستان کے چند مخلصین کے نام پیش کر رہا ہوں، جو ان کے شب و روز کے ساتھی تھے- خانوادۂ مجددیہ ماڈل کالونی (کراچی) کے آغا پیر عبداللہ مجددی، پیر فضل ربی مجددی، پیر فضل رحمٰن مجددی، مولانا ذاکر صاحب، مولانا اقبال اختر القادری، مولانا رضوان احمد نقش بندی، مولانا مفتی جان صاحب نعیمی، مولانا اطہر نعیمی سومرو، معراج مسعودی، کراچی کے سب ہی احباب اور اہل قلم، جامعہ نعیمیہ کراچی، اور دیگر جامعات کے علماو اساتذہ، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، ادارۂ مسعودیہ، سرہند پبلی کیشنز، مدینہ پبلشنگ کمپنی، امام ربانی فاؤنڈیشن کراچی، پروفیسر محمد عارف (بھاول پور) سید محمد طاہر (اسلام آباد) خانوادۂ ائمہ عیدگاہ (راول پنڈی) صوفی غلام سرور نقش بندی (لاہور) اور مولانا جمیل میاں (شرق پور) مفتی علیم الدین (جہلم) محمد عبدالستار طاہر، ڈاکٹر شیر محمد، محمد سعید مجاہد آبادی، جامعہ نعیمیہ لاہور کے اساتذہ اور ادارہ مظہر اسلام (لاہور) ان کے علاوہ پورے عالم اسلام میں پروفیسر صاحب کے عاشقین اور مخلصین کی ایک بہت طویل فہرست ہے جہاں سے ان کی یادیں حاصل کی جاسکتی ہیں-

آزادی سے قبل پروفیسر صاحب نے مسجد فتح پوری میں تشریف لانے والے اکابر ملت سے ملاقات کا شرف حاصل فرمایا تھا، جن میں اپنے والد ماجد حضرت مفتی اعظم شاہ مظہر اللہ کے علاوہ حضور مفتی اعظم ہند، حضرت صدر الافاضل، حضرت محدث اعظم ہند، حضرت علامہ رکن الدین الوری، حضرت علامہ زید ابوالحسن فاروقی، علامہ مفتی محمد محمود الوری، مولانا محمد مظفر احمد، مولانا مشرف احمد، مولانا محمد احمد اور بے شمار اکابر اہل سنت رحمۃ اللہ علیہم اجمعین قابل ذکر ہیں- مسجد فتح پوری میں ہر سال ۱۱ ربیع الاول شریف کو عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان جلسہ شب میں ہوتا تھا اور آج بھی ماشاء اللہ احقر کی سرپرستی میں اسی شان سے ہوتا ہے، جس میں علمائے اہل سنت تشریف لاتے ہیں، مسجد میں چراغاں ہوتا ہے، اور صلاۃ و سلام کی صدائیں گونجتی ہیں، ان صحبتوں کا اثر ان میں بدرجہ اتم موجود تھا جس کا وہ بار بار تذکرہ فرماتے تھے-

۲۸/اپریل ۲۰۰۸ء مطابق ۲۱/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ بروز پیر پروفیسر صاحب کا وصال ہوا، ۲۹/اپریل کو جنازہ میں صوبہ سندھ اور پاکستان کے تقریباً سب ہی جلیل القدر مشائخ، علمائے کبار، مفتیان عظام، دانشوران قوم و ملت اور مریدین و مخلصین اتنی بڑی تعداد میں شریک تھے کہ طارق روڈ مقبرۂ قائد اعظم سے ماڈل کالونی کراچی تک انسانوں اور پروفیسر صاحب کے پروانوں کا ہجوم نظر آرہا تھا- شاید کسی عالم دین یا کسی پروفیسر کے جنازہ میں بیک وقت اتنے لوگ پہلے شریک نہ ہوئے ہوں- ان کی کرامتوں کا ظہور زندگی میں بھی ہورہا تھا اور وصال کے بعد بھی بہت سی کرامتوں کا ظہور ہورہا ہے، جنازہ کے سبھی شرکا غمگین اور آبدیدہ تھے، جنازہ کی امامت صاحبزادہ مولانا مسرور احمد صاحب نے فرمائی-

وہ محقق تھے انہوں نے بہت سوں کو محقق بنادیا اس لیے ہر جگہ ان کی پذیرائی ہوتی تھی، دہلی میں، بریلی شریف میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں، اندور میں، ہر جگہ ان کے عاشقوں نے استقبال کیا، دہلی کی یونیورسٹیاں جامعہ ہمدرد، جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ، بمبئی والے، انگلستان والے اور سب ہی عالم اسلام کے اہم ادارے ان کو بلا کر استقبال کرنا چاہتے تھے، لیکن علمی خدمات میں خلل نہ واقع ہو، اس لیے وہ کہیں نہیں گئے، وہ جدھر نکل جاتے پذیرائی ہوتی یہ یقینی بات ہے، لیکن علما و مشائخ کی خدمات میں وہ خود بھی تشریف لے جاتے تھے اور ان کے پاس بھی بڑی محبت سے اکابر تشریف لاتے تھے، وہ علم دوست تھے، ان کی مخفل علم وفن کی تفصیل پرسند ہوتی تھی، ان کا گھر بند نہیں تھا بلکہ کھلا رہتا تھا، بیرون ملک کے محققین ان کے گھر پر قیام کرتے تھے، اور ہفتوں وہ انہیں رکھ کر تعاون فرماتے تھے اور ان کے قیام و طعام کا بندوبست فرماتے تھے، پروفیسر اوشا سانیال اس کی گواہ ہیں، وہ القاب و آداب کی لائنیں لکھ کر خوش نہیں ہوتے تھے، مولانا جاوید اقبال مظہری نے ایک بہت جامع مقالہ لکھا تھا جس سے حضرت پروفیسر صاحب کی عظمتوں کا اظہار تھا تو انہوں نے اسے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی-

وہ سرکاری ملازمت میں تھے، ۱۸ سال متعدد کالجوں کے پرنسپل اور بعد میں پاکستان میں ڈپٹی سیکریٹری محکمہ تعلیمات رہے، پرنسپل کی کتنی ذمہ داری ہوتی ہے اس کے باوجود انہوں نے تحقیقی کام کیے، انہوں نے

علم کو کسب دولت کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا، کبھی رائلٹی نہیں لی، احباب ومخلصین کی مدد فرماتے تھے، کبھی کسی سے ڈاک خرچ نہیں لیا، ملازمت سے جو کچھ ملا کتابوں پر اور خطوط بھیجنے پر صرف فرمایا، انہوں نے تحقیقی مقالوں کو کبھی فروخت نہیں فرمایا- ان کی خدمت میں سیٹھوں کی کمی نہیں تھی لیکن انہیں دست غیب تھا، جمع خوری اور بینک بیلنس بڑھانے کے وہ قائل نہیں تھے وہ تو تحفے اور نذرانے پیش کرتے تھے اور یہ سب کام خندہ پیشانی سے فرماتے تھے-

جام نور میں ڈاکٹر شرر مصباحی نے مقالہ لکھ کر پروفیسر صاحب کی عظمت پر انگلی اٹھائی ہے، اگر پروفیسر صاحب سے کوئی سہو ہوا ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرمانے والا ہے، میں اس ضمن میں کچھ نہ لکھتا، لیکن ڈاکٹر موصوف نے مقالے میں ناچیز کا دو مرتبہ ذکر فرمایا ہے، اس لیے چند لائنیں پیش کر رہا ہوں- ڈاکٹر موصوف نے جو کچھ لکھا ہے کیا وہ اہل علم کے یہاں محمود ہے؟ شریعت کا حکم ہے کہ مرنے والے کی نیکیوں کا ذکر کرو، کیا یہ اسی حکم کے مطابق ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ ان دونوں قسطوں کے مضمون میں ''اپنی تعریف اپنے قلم سے'' کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے تو کیا غلط ہوگا؟

''فوز مبین'' کے بارے میں انہوں نے جو تفصیلی گفتگو لکھی ہے اس کی بجائے اگر وہ یہ لکھتے کہ میں نے اس بارے میں یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو بہت اچھا لگتا، مرحوم نے جو کچھ کام کیے ہیں وہ کیا کم ہیں، جو کام رہ گئے ہیں وہ ہم اور آپ کریں کس نے منع کیا ہے؟ اس انداز میں تنقید کرنا اور ہدف ملامت بنانا ''نامور ادیب ونقاد'' کو زیب نہیں دیتا- ہندوستان میں تو رسائل زیادہ ہیں، مراکز موجود ہیں، علمی ادارے اور علما وفضلا کی جماعتیں بھی موجود ہیں، لائبریریاں اور علمی ذخائر موجود ہیں، ذرا سوچیے پروفیسر صاحب نے اپنے وطن سے دور غریب الوطنی میں جو کچھ کر دکھایا ہے اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں، وہ کئی تحقیقی منصوبے اور علمی پروجیکٹ چھوڑ گئے ہیں اس پر ڈاکٹر موصوف کام کر کے داد تحسین حاصل کرتے تو اچھا ہوتا اور صدقہ جاریہ ہوتا، بدگمانی پھیلانا تو گناہ جاریہ ہے-

ڈاکٹر موصوف کو شکوہ ہے کہ ان کے خطوط شائع نہیں کیے گئے کیوں؟ شاید...... اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ایک اندازہ کے مطابق پروفیسر صاحب کے پاس کم وبیش سال میں ایک ہزار خطوط آتے تھے بلکہ اس سے زیادہ ہی آتے ہوں گے، ساٹھ سال کی علمی زندگی میں اگر ساٹھ ہزار خطوط آئے ہوں گے تو کیا وہ سب شائع ہوئے ہیں؟ کیا پروفیسر صاحب نے خطوط شائع کرنے کا وعدہ فرمایا تھا؟ کیا ہر خط شائع کرنے کے قابل ہوتا ہے؟

انہیں یہ بھی شکوہ ہے کہ حدائق بخشش میں انہوں نے تصحیح قبول نہیں کی- محققین جانتے ہیں کہ قدیم نسخہ کی اہمیت ہوتی ہے، صاحب کلام کے انتقال کے بعد اصل نسخہ میں نہیں حواشی میں تصحیح کی جاتی ہے، بہر حال پروفیسر صاحب اردو زبان وادب پر اتھاریٹی تھے، انہوں نے حدائق بخشش میں یا تفسیر مظہر القرآن میں عمداً کوئی غلطی کی ہے جیسا کہ الزام ہے، یہ بات ذہن قبول نہیں کرتا-

کاش کوئی دیدہ ور ہمیں بتادے کہ فاضل ڈاکٹر موصوف کس فن پر اتھاریٹی ہیں؟ ان کے کتنے تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں؟ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب کی تعداد کتنی ہے؟ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ کس موضوع پر ہے؟ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے- (آمین) □□□□

بقیہ: علامہ ارشد القادری کی واقعہ نگاری

''یہ کالی گھٹاؤں کی طرح کاکل، یہ چاند کی طرح درخشاں پیشانی، یہ نور کی موجوں میں نکھرا ہوا چہرہ، یہ پروئے ہوئے موتیوں کی طرح دانتوں کی قطار، یہ پھولوں کی طرح پتلے پتلے ہونٹ، یہ گل ریز تبسم، یہ گہر بار تکلم، یہ رحمتوں کا سویرا، یہ سرمگیں آنکھیں، یہ معصوم اداؤں کا چشمۂ سیال، سچ بتائیے کیا یتیموں کی یہی سج دھج ہوتی ہے-''

جملہ بیانات وحواشی کے تناظر میں یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ علامہ ارشد القادری کی تحریر کی سج دھج مصنوعی نہیں بلکہ فطری ہے- وہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں- لالہ زار کو پڑھنے کے بعد قاری کے اندر پاک جذبات کی تحریک سرگرم ہوتی ہے- بلاشبہ قاری کے جذبہ احساس پر ان کہانیوں کا پاکیزہ اثر منعکس ہوتا ہے لوگوں کو کہانی پڑھنے اور لکھنے کی ترغیب حاصل ہوتی ہے لہٰذا اس اعتبار سے کتاب لالہ زار اردو فکشن میں گراں قدر اہمیت کی حامل ہے- اس کی تحریر سے رئیس القلم کی ذات بابرکات میں تخلیقی ادب کی زبردست صلاحیت موجود ہونے کی دلیل ملتی ہے- اگرچہ اردو ادب کے تاریخ نویسوں نے علامہ ارشد القادری کو اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ لالہ زار جیسی کتاب کے مطالعہ وجائزہ سے اردو کی نشو ونما میں صوفیہ اور علما کا حصہ یاد آجاتا ہے- □□□□

کیا عالم اسلام کا انقلاب اسلام کے حق میں ہے؟

نوٹ: ۔ماہنامہ ''جام نور'' اپنے اس کالم میں عصر حاضر کے کسی بھی مسئلہ کے تحت ہندوستان کے نامور علمائے کرام ودانشوران قوم و ملت سے ان کی تحریری رائے لیتا ہے۔موصول ہونے والی آراء خواہ وہ مثبت یا منفی پہلو پر ہوں، شائع کی جاتی ہیں تاکہ متعلقہ مسئلے کے دونوں پہلو ارباب علم ونظر اور عام قارئین تک پہنچ سکیں اور متعلقہ مسئلہ پر علمائے کرام ودانشوران قوم کی تحقیقی وتجزیاتی رائے کی روشنی میں مسئلے کے صحیح نتائج برآمد ہوسکیں، علما ودانشوران کی سہولت کے پیش نظر مندرجہ بالا سوال سے متعلق چند ذیلی نکات بھی دیے گئے تھے، تاکہ مندرجہ ذیل خطوط پر دلائل وبراہین کے ساتھ وہ اپنا تحقیقی جواب دے سکیں......

......(ادارہ)

نکات

{۱} عالم اسلام کا حالیہ انقلاب کن اسباب وعوامل کے تحت رونما ہوا ہے؟
{۲} اس انقلاب نے عالمی سطح پر مسلمانوں کی شبیہ کو کس طور پر پیش کیا ہے؟
{۳} یہ انقلاب عالم اسلام کو مستحکم کرے گا یا اسے مزید توڑ دے گا؟
{۴} یہ عرب حکمرانوں کے خلاف عرب عوام کا انقلاب ہے یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بین الاقوامی سازش ہے؟
{۵} یہ انقلاب قائدانہ محرومی، طوائف الملوکی، معاشی بحران اور مسلکی انتشار میں الجھی امت مرحومہ کو کیا عطا کرنے والا ہے؟

''اس انقلاب سے اگر اسلام کے مطلوبہ نظام عدل کو صحیح معنوں میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا تو اس سے اسلام اور مسلمان دونوں کی شبیہ روشن ہو کر ابھرے گی، ورنہ حالات اور زیادہ خراب ہوں گے''

پروفیسر اختر الواسع☆

(۱) لوگ چاہے جو بھی کہیں میری ناقص رائے میں جو کچھ عالم عرب کے کچھ ممالک میں ہو رہا ہے اس کا بنیادی محرک اور سبب وہاں کے حکمرانوں کی متواتر اور مستقل اسلام سے دوری ہے۔یہ بات میں اس طرح رواروی میں نہیں کہہ رہا ہوں جیسا کہ عام طور پر ہمارے یہاں اس طرح کی باتیں دہرانے کی عادت پڑی ہے۔میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اسلام دنیا کا پہلا ایسا مذہب تھا جس نے جمہوری قدروں کی نہ صرف ستائش کی بلکہ عملی طور پر انہیں ممکن العمل بنا کر دکھایا۔یہاں ہم جب جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد قطعاً مغربی طرز جمہوریت سے نہیں ہے، لیکن اگر جمہوریت کا مطلب حکمراں کے انتخاب میں عوامی رائے کا احترام اور حصے داری ہے، اگر اس کا مقصد انتظامی امور میں شفافیت ہے اور اگر اس کا مطلب حکمرانوں کی عوام کے سامنے جواب دہی ہے تو اسلام ایسی جمہوریت کا سب سے بڑا حامی ہے۔آپ مجھے خلفائے راشدین میں سے کسی ایک کی مثال دے دیجیے جس نے خلیفہ بنائے جانے کے اعلان کے باوجود اس وقت تک اس بار امانت کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہو جب تک بیعت عام نہ ہوگئی۔اسی طرح سے خلافت راشدہ میں انتظامیہ کی شفافیت سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں اور اسی طرح حکمرانوں کی جواب دہی کے لیے اس بدّو کو یاد کرلینا کافی ہوگا جس نے فاروق اعظم جیسے خلیفہ سے مال غنیمت میں آئی ہوئی چادر کا حساب مانگ لیا۔محض یہی ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ سیکڑوں ایسے واقعات ہیں جن سے لوگ واقف ہیں اور یہاں پر بھی انہیں دہرایا جاسکتا ہے۔

جہاں تک حکومت کے فیصلوں سے اختلاف کا حق اور ان کے خلاف اپنی آواز اٹھانے کا معاملہ ہے تو اس کی مثالیں قرون اولیٰ میں بدرجہ اولیٰ

☆Head:Islamic Studies Dept.Jamia Millia Islamia,Jamia Nagar,New Delhi-25

دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ یاد کیجیے اس صاحب عزیمت خاتون کو جس نے حضرت عمرؓ کو مہر کی رقم کی تحدید کے فیصلے کو واپس لینے پر مجبور کردیا۔ یہ اسلام ہے اور اسلامی نظام حکمرانی ہے۔ ان تمام عرب ممالک میں جہاں جہاں حکمرانوں کے خلاف بے چینی کا اظہار ہو رہا ہے ان میں سے کون ہیں جنہوں نے اسلام کی ان ترقی پسند، انسانی عجز و وقار کی ضامن اقدار و روایات کو اپنایا ہو، ان کو نافذ العمل کیا ہو۔ اسلام اخوت، حریت اور مساوات کا حامل مذہب ہے۔ بقول حضرت عمرؓ "جن انسانوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا انہیں غلام بنانے کا ان حکمرانوں کو کس نے حق دے دیا" تو اگر ان کے خلاف یہ سب ہو رہا ہے تو اس پر تعجب کیا ہے؟ تعجب تو اس پر کیجیے کہ اتنی دیر کیوں لگی!

(۲) جو کچھ تیونس اور مصر میں ہوا، اس سے ایک بات تو دنیا کے سامنے بلاشبہ آگئی کی عام مسلمان خواب غفلت میں نہیں پڑے ہوئے ہیں۔ دنیا کو یہ بھی پتا چلا کہ وہ حکمران جنہیں مغربی ممالک اپنا معتمد اور حلیف سمجھتے رہے ہیں ان کی بظاہر انتہائی مضبوط نظر آنے والی حکومتوں کی بنیادا تنی کمزور ہیں۔ تیسرے وہ ممالک جہاں ابھی اختلافات کی آوازیں بلند بانگ ہو کر سامنے نہیں آئی ہیں وہاں کے حکمرانوں کے لیے ایک موقع ہے کہ وہ بھی دیواروں پر لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھ لیں اور اپنے اپنے ملکوں اور نظام حکمرانی میں مثبت اور معقول تبدیلیاں لائیں، قومی آمدنی کو اپنے ملک اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے پوری دیانت داری سے خرچ کریں نا کہ غیر ملکی بینکوں میں کالے دھن کے طور پر جمع کریں اور مغربی طاقتیں جب بھی چاہیں ان کے ان اثاثوں کو منجمد یا ضبط کر دیں۔

(۳) اگر ایک آمر کی جگہ دوسرے آمر نے لے لی تو کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے، کیوں کہ برقعہ بدل جانے سے عورت نہیں بدل جاتی اور اگر ایسا ہی رہا تو حالات اور زیادہ خراب ہوں گے، ایسے ممالک میں غربت اور استحصال اپنی انتہاؤں کو پہنچ سکتے ہیں، لیکن اگر سلطانی جمہور کی آرزوں، امنگوں اور خواہشوں کا احترام کیا گیا اور اسلام جس نظام عدل کا نقیب ہے اس کو صحیح معنوں میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا تو اسلام کے حوالے سے یہ ایک نئی صبح کی نوید ہوگی اور اس سے اسلام اور مسلمان دونوں کی شبیہ روشن ہو کر ابھرے گی۔

(۴) ہر چیز کو اپنے خلاف دوسروں کی سازش قرار دینا کسی صحت مند سوچ کی غماز نہیں ہے اور یہ ان صاحب عزیمت انسانوں کے ناقابل تسخیر جذبہ حریت کی بھی توہین ہے جنہوں نے ان انقلابی کوششوں کو اپنے مقدس خون سے سرخی عطا کی ہے۔ اگر اسلام اور مسلمانوں کے مخالفوں کا بس چلتا تو وہ تیونس اور مصر میں کوئی تبدیلی ہی نہیں ہونے دیتے۔ چونکہ جو حکمراں وہاں سے ہٹائے گئے ہیں یہ تو مغرب ہی کی کٹھ پتلیاں تھے۔ ہاں اگر آپ کوئی واضح حکمت عملی نہیں تیار کریں گے، اتحاد فکر و عمل نہیں ہوگا تو کوئی بھی کیوں غافل بیٹھے گا اور آپ کی نادانی سے فائدہ کیوں نہیں اٹھانا چاہے گا۔ اس تمام صورت حال میں یہ بات ضرور ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ہر سیاسی جغرافیائی وحدت میں اس سے وابستہ لوگوں کو ہی اپنی اور اپنے ملک کی قسمتوں کے فیصلے کا حق ہونا چاہیے۔ کسی بھی طرح کی بیرونی مداخلت کو اس سلسلے میں نہ تو جائز قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ اسے قبول کرنا چاہیے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ استعماری قوتیں مسلم ممالک کے قدرتی وسائل یا ان کے اسٹرا ٹیجک پوزیشن سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے ان پر براہ راست یا بالواسطہ قبضے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ بلیوں کی لڑائی میں بندر کو پنچ بنانے کی غلطی کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح بدو کو اپنے خیمے میں اونٹ کو سر رکھنے کی اجازت بھی خود بدو کی بے دخلی کا پروانہ ہوتی ہے۔ اگر کسی باہری ایجنسی کو مفاہمت کا کوئی رول انجام دینا ہے تو اس کے لیے سب سے پہلے اندرونی میکینزم کو ترجیح دینی چاہیے اور اگر وہ بالکل مفقود ہے یا ناممکن ہے تو پھر OIC یا عرب لیگ کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس سارے خلفشار میں جس سے کہ بعض عرب ممالک دو چار ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو ایک اور خطرے سے محفوظ رکھنا ہے اور وہ ہے اس بے چینی اور احتجاج کو مسلکی عناد اور فرقہ ورانہ عصبیت قرار دے کر مطعون کرنا۔ نا تو کسی کو اسے مذکورہ بالا بنیاد پر بدنام کرنے یا دبانے کی اجازت ہونی چاہیے اور نہ ہی کسی کو ان بنیادوں پر اس کی حمایت کرنے کی۔

(۵) میں لا تقنطوا پر ایمان رکھتا ہوں، اس لیے مایوسی ہمارے یہاں کفر ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ مسلمان معاشروں اور ملکوں میں ایک نئی سوچ جنم لے رہی ہے۔ وہ سوچ جو جمہوریت کی ہم نوا ہے۔ جو قومی وسائل اور پیداوار میں اپنا حق چاہتی ہے، جو آمریت، مطلق العنانیت، طبقاتی تفریق

اور عصبیتوں سے بیزار ہے- اس لیے یہ حکمراں جتنی جلدی سنبھل جائیں بہتر ہے- انہیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے مغربی آقا صرف اپنے مفاد کو عزیز رکھتے ہیں اور انہیں محض اپنے ایک معمولی کارندے کے طور پر استعمال کرتے ہیں- اور اگر انہیں یقین نہ ہو تو یہ ایران کے شہنشاہ، مصر کے حسنی مبارک، تیونس کے زین العابدین بن علی اور لیبیا کے معمر قذافی کے انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں- صرف ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ حکمراں نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ اسلام کے لیے بھی بوجھ بنے ہوئے ہیں- اب بھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے- اب بھی جاگ جائیں تو سویرا ہے- صلاح وفلاح کے راستے پر گامزن ہوں اور خوف خدا اور خدمت خلق کو اپنا منشور بنائیں اور ایک نئے عہد کا آغاز کریں-□□□

"بیرونی طاقتیں آج عالم اسلام میں بھی سازشیں کر رہی ہیں، لیکن میری نگاہیں اس عوامی بیداری میں ایک بہتر مستقبل کے بیج دیکھ رہی ہیں جن کی کونپلیں نکلنے میں دیر تو لگ سکتی ہے، یہ بیج آسانی سے مر نہیں سکتے"

احمد جاوید☆

بریان ڈائی سن دنیا کی ایک سب سے بڑی مشروبات بنانے والی کمپنی کا سربراہ (چیف ایگزیکیٹو) ہے- پچھلے دنوں اس نے اپنی کمپنی کے اہل کاروں سے خطاب کیا تھا جس کو دنیا کی مختصر ترین جامع تقریر قرار دیا گیا- ڈائی سن نے کہا تھا: کام، خاندان، صحت، دوست اور روح پانچ گیندیں ہیں جن کو ہم لوگ سرکس کے کھلاڑی کی طرح بیک وقت ہوا میں اچھالتے اور پکڑتے رہتے ہیں لیکن پھر زندگی کے ایک حصے میں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کام ربڑ کی گیند ہے جب کہ باقی چار گیندیں شیشے کی ہیں اور یہ اگر ایک بار گر جائیں تو ٹوٹ جاتی ہیں یا ان میں دراڑ آجاتی ہے یا پھر کسی زاویہ سے دب جاتی ہیں-

مشرق وسطی کی تاریخ آج اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے- جن حکمرانوں کے خلاف اس وقت عرب اور افریقی ممالک میں عوامی انقلاب کا طوفان اٹھ رہا ہے، یہ سب کے سب انقلاب کی پیداوار تھے- یہ چاہتے تو اپنی قوموں کے ہیرو بن جاتے، رہتی دنیا تک اچھے ناموں سے یاد کیے جاتے لیکن انہوں نے اقتدار وحکومت کو ہی سب کچھ سمجھ لیا- نہ یہ سمجھا کہ ملک وقوم حکمرانوں کے خاندان ہوتے ہیں، نہ ملک ومعاشرے کی صحت پر توجہ دی، نہ دوستوں کی قدر کی اور نہ اپنے ضمیر کی آواز سنی- اس کا انجام جو ہونا تھا، وہی ہو رہا ہے- عالم اسلام کے ان ملکوں میں اس وقت جو بیداری آپ کو دیکھنے کو مل رہی ہے، وہ وقت کا جبر اور تاریخ کی کروٹ ہے جس کو یہ حکمراں سمجھنے سے قاصر ہیں- وقت کے ساتھ عوام کے اندر تعلیم آئی ہے، ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا ہے، مواصلات کی ترقی نے دنیا کو ایک گاؤں بنا دیا ہے- اب جو ہوا دنیا کے کسی کونے میں چلتی ہے، دوسرے کونے تک پہنچتے دیر نہیں لگتی، ڈکٹیٹروں کے جبر واستبداد سے عاجز آچکے لوگوں پر ان کی گرفت وقت نے ڈھیلی کر دی ہے، فوجی تاناشاہوں کو خاندانی حکومت کے خلاف عوام کے جذبات میں ابال کے لیے مہنگائی اور بے روزگاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا- اسی کے ساتھ عوام کے مختلف طبقات میں جو روایتی دوریاں تھیں ان میں کمی آئی، غلط فہمیاں، تعصبات، تحفظات اور منافرتیں دور ہوئیں، مسلکی ومذہبی ٹکراؤ میں کمی آنے اور ایک دوسرے کے خلاف شکوک وشبہات، اندیشے اور خوف کے جذبات میں کمی نے اس طوفان کو جنم دیا جو تیونس سے مصر، لیبیا، شام، اردن، بحرین اور یمن تک پھیل گیا- بغور دیکھیں تو یہ بتوں کے ٹوٹنے کا موسم ہے- یہ سب کے سب ایک ہی زمانے اور ایک سی فکر کے بنائے ہوئے بت ہیں جو اس وقت عوامی بیداری کے سامنے لرز رہے ہیں، ٹوٹ رہے ہیں، بکھر رہے ہیں- مسلم معاشروں کی زوال پذیری اور فکری جمود کے دور میں بیرونی طاقتوں کی مدد سے ان کو اپنے پیر جمانے اور قد اونچا کرنے کا موقع ملا لیکن اب جوان بتوں کا گرنا شروع ہوا تو وہ اسی رفتار سے تابڑ توڑ گر رہے ہیں جس رفتار سے اور جس انداز میں یہ کھڑے ہوئے تھے- ویسے تو یہ سلسلہ تیونس سے شروع ہوا جب صدر زین العابدین بن علی کو ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا، پھر مصر اور اب لیبیا، یمن اور بحرین میں بت ٹوٹ رہے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سلسلہ بغداد کے فردوس اسکوائر سے شروع ہوا- دوسرا بت اس وقت ٹوٹا جب بغداد میں ایک عراقی صحافی منتظر زیدی نے صدر امریکہ بش پر جوتا پھینکا، تیسرا بت اس وقت ٹوٹا جب وہائٹ ہاؤس میں ایک سیاہ فام صدر آگیا-

میں نے عرض کیا کہ حال کے برسوں میں مسلمانوں کی آپسی دوریاں دور ہوئی ہیں، مسلک اور فرقوں، نظریات وعقائد کی دیواریں نیچی ہوئی

☆Chief Editor, Hindustan Express, New Delhi-Email: ahmedjawed1970@yahoo.com

ہیں- بہت سی گرہیں ڈھیلی پڑی ہیں- پچھلے دنوں مشہور مصری عالم دین علامہ یوسف القرضاوی نے ریاض (سعودی عرب) میں ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میری خواہش ہے کہ سارے وہابی صوفی ہوجائیں اور سارے صوفی وہابی ہوجائیں-" کسی کو کیا معلوم تھا کہ ابھی ان کے اس قول کی بازگشت بھی ختم نہ ہوئی ہوگی کہ مصر کے لوگ سیلاب کی طرح سڑکوں پر اتر آئیں گے اور مسلک و مذہب کی سرحدیں ان کو ایک ہونے سے روک نہ سکیں گی- یہاں تک کہ حسنی مبارک اور اس کے صہیونی آقاؤں کی مصر میں عیسائی مخالف فسادات اور فرقہ وارانہ تشدد پھیلانے کی سازشیں بھی کام نہ آئیں گی- دنیائے عرب کو سیاسی، سماجی اور جغرافیائی طور پر تین حصوں میں بانٹ کر دیکھا جاسکتا ہے:

1- اب جزیرۃ العرب کا وہ علاقہ جہاں سعودی عرب، عراق، کویت، یمن اور امارات واقع ہیں، اس خطے میں انقلاب کی لہریں زیادہ طاقتور نظر نہیں آتیں لیکن اضطراب سب سے زیادہ یہیں ہے- القاعدہ اسی خطے میں زیادہ مضبوط و متحرک ہے- تیل کی دولت اور سیاسی و دینی قیادتوں کے مضبوط گٹھ جوڑ نے یہاں جمہوریت پسند قوتوں کو دبا رکھا ہے لیکن جہاں بھی استبدادی طاقتوں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے، وہ ابھر کر سامنے آرہی ہیں، بحرین، یمن اور سعودی عرب کے بعض علاقوں کی صورت حال اسی حقیقت کی غماز ہے-

2- دوسرا حصہ وہ ہے جہاں دنیائے عرب کے قدیم تہذیبی و ثقافتی مراکز واقع ہیں- مصر، شام، فلسطین اور اردن- اسی خطے میں عالم اسلام کا ناسور اسرائیل واقع ہے- یہی علاقہ عرب قومیت کی تحریکوں کا میدان عمل رہا ہے- یہاں کے لوگ سیاسی اعتبار سے نسبتاً بیدار ہیں-

3- تیسرا حصہ مغرب کا ہے جو مراقش، لیبیا، تیونس، موریطانیہ اور شمالی افریقہ کے دوسرے عرب ممالک پر مشتمل ہے- اس خطے میں جمہوریت کی لہر سب سے زیادہ مضبوط اور تیز ہے کیونکہ یہاں مسلکی منافرت اور بٹوارے کم ہیں- یہ ممالک یوروپ سے قریب ہیں اور یہاں صوفیہ کے اثرات زیادہ ہیں-

عالم اسلام میں فوجی انقلابات کا سلسلہ مصر کے انقلاب کے بعد تیز ہوا تھا- پہلے جمال عبدالناصر آئے، پھر بغداد، شام، لیبیا اور یہاں تک کہ پاکستان میں فوجی جرنیلوں نے حکومتوں کے تختے پلٹے- یہی جرنیل اس وقت مسلم قوموں کے ہیرو تھے- میرا خیال ہے کہ یہ ہوا ترکی سے چلی تھی جہاں ایک فوجی انقلاب نے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے ترکی کو جدید سیکولر ملک بنادیا تھا- اس کے بیس پچیس سال بعد ایک ایک کر کے مختلف ملکوں کی فوجوں نے حکومت کے تختے پلٹ دیے- یہ محض اتفاق ہے کہ جمہوریت کی یہ تازہ ہوا بھی عالم اسلام میں ترکی سے چلی ہے- جہاں پچھلے عشرہ میں اسلام پسندوں کی حکومت اقتدار میں آئی اور ایک طویل جدوجہد کے بعد اقتدار پر فوج کی گرفت ڈھیلی پڑی- اس وقت وہاں آئینی اصلاحات روبہ عمل ہیں اور ترکی میں آئندہ 12 جون (201) کو ہونے والا عام انتخاب 'نئے جمہوری آئین' کے موضوع پر ہو رہا ہے- اسلام پسندوں کی جماعت انصاف و ترقی پارٹی (اے کے پی) "انصاف و ترقی کو ووٹ دیں اپنا آئین خود لکھیں" کے نعرے کے ساتھ میدان میں اتری ہے- یہ وہی ترکی ہے جہاں کل تک کمال اتاترک کے نافذ کردہ آئین کے خلاف زبان پر کوئی حرف لانا بھی ناقابل معافی جرم تھا- ترکی کی اس تبدیلی نے مشرق وسطیٰ کے اسلام پسندوں کو بھی متاثر کیا ہے اور وہ اب جمہوری طریقے سے تبدیلی لانا چاہتے ہیں- ایران میں اسلامی جمہوریت کی کامیابیوں نے بھی عرب نوجوانوں کو متاثر کیا ہے- وہ جب ان عجمی حکمرانوں کو مغربی طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے دیکھتے ہیں تو اپنے حکمرانوں پر ان کا غصہ اور بھی شدید ہوجاتا ہے- یہ فیصلہ سنا دینا کہ یہ انقلاب عالم اسلام کو مستحکم کرے گا یا اسے مزید توڑ دے گا، قبل از وقت ہوگا- کسی بھی عوامی انقلاب کی کامیابی اور ناکامی کو بہت سے عوامل متاثر کرتے ہیں اور اس کا انحصار اس قیادت کی دانش مندی پر ہوتا ہے جو اس انقلاب کی کوکھ سے ابھرتی ہے- اس کی بڑی واضح مثال برصغیر کی آزادی اور ہماری آزادی کے باسٹھ سال ہیں- ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہی سرزمین کے دو حصے (ہندوستان اور پاکستان) ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں- سازشیں کہاں نہیں ہوتیں اور بیرونی طاقتیں ملکوں اور قوموں کے اندرونی انتشار سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں کہاں نہیں کرتی ہیں- آج ان ملکوں میں بھی کر رہی ہیں لیکن میری نگاہیں اس عوامی بیداری میں ایک بہتر مستقبل کے بیج دیکھ رہی ہیں جن کی کونپلیں نکلنے میں دیر تو لگ سکتی ہے لیکن یہ بیج آسانی سے مرنے والے نہیں ہیں- اس طوفان سے نسبتاً "جمہوری اور مستحکم عالم اسلام" ابھرنے کی امیدیں کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ ان ملکوں کے عوام اسلام دشمن طاقتوں کے فریب میں نہ آئیں اور بیرونی ملکوں کے کھلونے نہ بنیں- □□□

اظہارِ خیالات

اس کالم میں آپ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور ملی کسی بھی مسئلہ پر اپنی فکر اور اپنے خیال کا برملا اظہار اور بے لاگ تبصرہ کر سکتے ہیں جو ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائے گا، واضح ہو کہ اس سلسلے میں آپ کی تحریر مختصر اور جامع ہونی چاہیے............(ادارہ)

ایک ضروری تصحیح

دلشاد احمد قادری

استاد: مدرسہ قادریہ، مولوی محلہ، بدایوں شریف (یوپی)

مکرمی مدیر اعلیٰ! اسلام مسنون......اپریل کا شمارہ ''محدث اعظم نمبر'' موصول ہوا، دیدہ زیب وقیع اور جامع نمبر شائع کرنے پر مبارک باد قبول فرمائیں- اداریہ خاص طور سے قابل مطالعہ اور فکر انگیز ہے، دیگر مضامین میں ذیشان صاحب کا طویل مضمون خصوصیت سے پسند آیا، آپ نے میرا مختصر مضمون بھی شامل اشاعت کیا، اس کا شکریہ-

مولانا نورین علی حق صاحب کا مضمون ''مجدد خانوادۂ اشرفیہ: اعلیٰ حضرت سید علی حسین اشرفی میاں'' بھی عمدہ ہے، مگر اس مضمون میں حضرت تاج الفحول سے متعلق ایک مشہور واقعہ غلط انداز میں نقل ہو گیا ہے، جس کی اصلاح ضروری ہے، نورین صاحب کے بارے میں مجھے کوئی بدگمانی نہیں ہے کہ انہوں نے قصداً واقعہ کو تبدیل کر دیا ہو، کیوں کہ وہ اپنے ماخذ کا حوالہ دے کر بری الذمہ ہو گئے ہیں، نورین صاحب لکھتے ہیں:

''آپ کے (حضرت تاج الفحول کے) ہمراہ آپ کے پیر خانہ مارہرہ مطہرہ کے صاحبزادگان عالی گرامی حضرت مولانا سید شاہ اسماعیل حسن شاہ جی میاں اور حضرت مولانا شاہ حامد حسن بھی مصروف سعی تھے، حضرت تاج الفحول نے اچانک سعی کی ترتیب بدل دی، حضرت شاہ اسماعیل حسن نے شاہ حامد حسن سے کہا کہ حضرت تاج الفحول صاحب سے پوچھو اس تبدیلی سعی کی کیا وجہ ہے؟ چنانچہ انہوں نے تاج الفحول سے دریافت کیا تو حضرت تاج الفحول نے ارشاد فرمایا کہ ''آپ نے دیکھا نہیں کہ سامنے سے شبیہ غوث الثقلین شاہ علی حسین صاحب قبلہ جیلانی آ رہے تھے، میں کیسے ان کی طرف پشت کرتا''- دوسرے دن صبح کو تینوں حضرات نے ایک دوسرے سے شب کا واقعہ بیان کیا کہ ''آج کی شب حضرت سیدنا غوث الثقلین قطب الکونین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دولت دیدار سے مشرف ہوا''- (جام نور اپریل، ص: ۱۹/۱۸، بحوالہ حیات مخدوم الاولیاء ص: ۹۲)

پھر نورین صاحب نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے قصیدہ چراغ انس کے دو شعروں کا حوالہ یہ کہہ کر دیا ہے کہ ''ان میں مذکورہ واقعہ کا بیان ہے'' وہ شعر یہ ہیں:

میں بھی دیکھوں جو تو نے دیکھا ہے — روز سعی صفا محب رسول
ہاں یہ سچ ہے کہ یاں وہ آنکھ کہاں — آنکھ پہلے دلا محب رسول

اس پر عرض ہے کہ یہاں واقعہ غلط طور پر نقل ہو گیا ہے، صحیح واقعہ یوں ہے کہ سعی کے دوران میلین اخضرین کے درمیان تیزی کے ساتھ چلنے کا حکم ہے، لیکن ان کے درمیان بھی حضرت تاج الفحول آہستہ آہستہ چل رہے تھے، یہ دیکھ کر حضرت شاہ اسماعیل حسن شاہ جی میاں علیہ الرحمہ کو تعجب ہوا کہ حضرت تاج الفحول اس مقام پر آہستہ کیوں چل رہے ہیں، آپ حضرت تاج الفحول کے شاگرد تو تھے ہی ساتھ میں حضرت کے مخدوم زادے بھی تھے اور دیگر لوگوں کے مقابلہ میں حضرت تاج الفحول سے زیادہ بے تکلف تھے- آپ نے کسی وقت موقع نکال کر اس بارے میں حضرت تاج الفحول سے دریافت کیا کہ وہ کیا کیفیت تھی؟ حضرت تاج الفحول نے ارشاد فرمایا کہ صاحبزادے اگر اور کوئی پوچھتا تو شاید میں جواب نہ دیتا، مگر آپ چونکہ میرے مخدوم زادے ہیں، اس لیے آپ سے عرض کرتا ہوں کہ سعی کے دوران میرے آگے آگے سرور کونین ﷺ اور غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

چل رہے تھے، اس لیے میں ادباً آہستہ آہستہ چل رہا تھا- یہ اصل واقعہ ہے اس کے بعد اب آپ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے مذکورہ اشعار پڑھیں تو ان کی معنویت اجاگر ہوگی، ورنہ اگر دوران سعی صرف اعلیٰ حضرت اشرفی میاں کی زیارت ہوئی ہوتی تو پھر ان اشعار کی کوئی خاص معنویت باقی نہ رہے گی- اس واقعہ کی تصدیق مارہرہ شریف میں حضرت امین ملت اور حضرت شرف ملت سے بھی کی جاسکتی ہے، کیونکہ ان کے خانوادے میں بھی یہ واقعہ اسی طرح سینہ بہ سینہ نقل ہوتا ہوا آرہا ہے، جس کو یہ حضرات کئی بار تقریروں میں بھی بیان کر چکے ہیں-

ہاں! البتہ اعلیٰ حضرت اشرفی میاں اور اعلیٰ حضرت تاج الفحول کے بارے میں یہ واقعہ اکابرین کی زبانی سنا گیا ہے کہ حضرت تاج الفحول اجمیر شریف میں حاضر تھے اور اعلیٰ حضرت اشرفی میاں بھی وہاں موجود تھے، جب حضرت تاج الفحول کی نظر حضرت اشرفی میاں کے چہرے پر پڑی تو آپ نے بے ساختہ فرمایا کہ ''یہ کون بزرگ ہیں جو ہو بہو حضور غوث اعظم کی ہم شکل ہیں، اسی کے بعد سے اعلیٰ حضرت اشرفی میاں کو ''ہم شبیہ غوث اعظم'' کہا جانے لگا-

نئی نسل کو محدث اعظم ہند کے کارناموں سے متعارف کرانے کی ضرورت

محمد امان اللہ رضوی
رکن: بیدار فاؤنڈیشن ویشالی (بہار)

مکرمی مدیر اعلیٰ! السلام علیکم...... آپ کے مؤقر رسالہ ''جام نور'' کے فروری کا تازہ شمارہ محترم مولانا ممتاز ویشالوی امام عزیز المساجد الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے ذریعہ ہم دست ہوا- میں تقریباً دو سالوں سے اس کا مستقل قاری ہوں- اس کے مقناطیسی مضامین ہجوم کار کے باوجود بھی قاری کو دامن کشاں رہنے نہیں دیتے، چنانچہ یہ شمارہ بھی اسی مقناطیسی کشش کا آئینہ دار ہے- تمام مضامین معلوماتی اور معیاری ہیں- مولانا مبارک حسین مصباحی کا مضمون اور ڈاکٹر نور احمد شاہتاز صاحب کا انٹرویو ہماری جماعتی جمود کو خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے اور پختہ عزم و ارادہ کے ساتھ زمانے کے تقاضوں سے آراستہ ہو کر میدان کار میں آنے پر مہمیز کرتا ہے- تلخ و شیریں تعریف و تحسین اور تنقید و مخالفت کے بیچ جس بلند ہمتی اور اولوالعزمی کے ساتھ آپ نے ۹۹ رجام قاریوں کی دہلیز تک پہنچایا ہے اس پہ آپ کو اور آپ کی پوری ادارتی ٹیم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ملت اسلامیہ کے فکری جمود کو توڑنے والا اور امت مرحومہ کو نئی سمت میں اعتدال کے ساتھ چلنے کی دعوت دینے والا یہ جام صبح قیامت تک نئی نئی توانائیاں بخشتا رہے-

محدث اعظم ہند کی ذات ہندو پاک کے علما و مشائخ کے مابین اس قدر مقبول تھی کہ بیک وقت زباں سے آپ کو اپنا ''حکم'' تسلیم کرتے تھے- آج جب کہ اکابر شخصیتوں کو فراموش کرنے کا سلسلہ چل پڑا ہے، ایسے میں محدث اعظم ہند کی حیات و خدمات اور ان کی لائق تقلید کارناموں سے دنیا کو واقف کرانے کی اہمیت و معنویت اور بڑھ جاتی ہے- یقیناً آپ نے اس دور میں ''محدث اعظم نمبر'' نکال کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے، جس پہ ہم اپنی جانب اور تنظیم ''بیدار فاؤنڈیشن ویشالی'' کے تمام ممبران کی جانب سے آپ کو اور آپ کی پوری ادارتی ٹیم کو مبارک باد پیش کرتے ہیں- اللہ کرے! حضور محدث اعظم ہند کی حیات و خدمات اور ان کی تبلیغی و تنظیمی کارناموں سے واقفیت حاصل کر کے ہماری نئی نسل کچھ کام کرے-

داعیان دین کے لیے لمحۂ فکریہ!

محمد عبداللہ سرورؔ اعظمی
مدرس: جامعہ حرا انجم العلوم، مہاپولی، ضلع تھانے (مہاراشٹر)

محترمی! اسلام مسنون...... برصغیر ہندو پاک میں متعدد جماعتیں دین متین کے فروغ اور ترویج و اشاعت میں سرگرداں ہیں، کچھ جماعتیں کافی حد تک کامیاب بھی ہیں، مگر بعض کچھ نقائص کی وجہ سے اپنے مقصد میں ناکام نظر آتی ہیں- آج اہل سنت کے سامنے پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا بہت بڑا چیلنج بن کر سینہ تانے کھڑے ہیں اور ہماری جماعت کے علما ان کے جائز و ناجائز ہونے کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں اور یہ مسئلہ جماعت اہل سنت میں تقریباً خانہ جنگی کی نوعیت اختیار کر چکا ہے- یہود و نصاریٰ کے علاوہ باطل فرقوں نے بھی ایسی ویب سائٹس (Websites) بنالی ہیں، جن

کے دیکھنے کے بعد اچھے خاصے مسلمان کا ذہن خراب ہو جاتا ہے اور ان نشریات کو اپنی عملی زندگی میں لانے کے بعد اس کے اعمال کے ساتھ ساتھ اس کا عقیدہ بھی خراب ہو جاتا ہے- اسی طرح پال ٹاک (Paltalk) پر درجنوں ایسے لائیو (Live) پروگرام نشر ہوتے ہیں جن میں بہ کثرت مسلمان شریک ہو کر باطل عقائد والوں سے علم دین حاصل کرنے کے نام پر اپنے عقائد خراب کر رہے ہیں، خصوصاً نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ اس میں حد درجہ گرفتار ہے- کچھ ویب سائٹس ایسی ہیں، جن میں اہل سنت کے عقائد اور شخصیات کو مسخ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے-

یہ بات مسلم ہے کہ اسٹیجوں اور مسجدوں سے ہر دور میں دعوت دین عام کی جاتی رہی ہے اور قیامت تک کی جاتی رہے گی، مگر آج دشمنان اسلام نے نیا جال تیار کر لیا ہے، وہ یہ کہ نوجوان طبقے کی اکثریت انٹرنیٹ کا استعمال کر رہی ہے اور انہوں نے اسلام مخالف مواد انٹرنیٹ پر اس انداز میں نشر کیا ہے کہ اس سے کسی بھی انسان کا ذہن خراب ہو جائے- لہٰذا آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل سنت و جماعت کی کوئی تنظیم ایسی ہو جو باصلاحیت علما کی رہنمائی میں منظم انداز میں اس عظیم فتنے کی سرکوبی کرے اور مسلمانوں کے ایمان و اعمال کی حفاظت کرے-

جماعت کی اکثریت جام نور کی مؤید ہے

فہیم احمد ثقلینی
استاذ: دارالعلوم شاہ ثقلین، قصبہ ککرالہ، ضلع بدایوں (یوپی)

مولانا خوشتر نورانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ...... بعد از مراسم مسنونہ عرض ہے کہ فروری ۲۰۱۱ کا شمارہ مطالعہ کی میز پر ہے حسب سابق شمارہ کے جملہ مشمولات خوب سے خوب تر ہیں، جام نور درحقیقت اسم بامسمّٰی ہے جو اپنے نورانی جام سے اہل علم وبصیرت اور صاحب فکر ودانش کو فیض یاب کر رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ جوق در جوق جام نور کے نورانی قافلہ سے جڑتے جا رہے ہیں- ہماری جماعت کی اکثریت جام نور کی مؤید ہے- جام نور عصر حاضر میں نئی نسل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے- اس نے ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کے بارے میں سوچنا سکھا دیا ہے اور خواب خرگوش کے مزے لینے والوں کو بیدار کر رہا ہے- آج بھی ہماری جماعت میں ایسے ناعاقبت اندیش موجود ہیں جنھیں دینی، مذہبی، سماجی، سیاسی اور علمی میدان میں ملت اسلامیہ کی نہ کوئی فکر ہے اور نہ کوئی درد-

مسلکی انحراف اور مشربی تعصب نے ہماری جماعت کو ان گنت ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا ہے، ہر شخص ڈیڑھ اینٹ کی مسجد لیے الگ بیٹھا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کنویں کے مینڈکوں کو اتحاد واتفاق سے چڑ ہے- یہ لوگ صرف منفی پہلو پر زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں- مثبت پہلو پر کام کرنا دور کی بات ہے گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتے- رسالہ جام نور مستقل ۹۹ شماروں کے بعد تاریخی صد شمارہ کی اشاعت پر خانقاہ شجاعتیہ ککرالہ اور ہمارے ادارہ کے اساتذہ وارکین کی طرف سے مبارک باد پیش ہے اور دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ ادارہ جام نور کو عمر خضر عطا فرمائے- مخالفین وحاسدین کو راہ راست اور ہدایت کی توفیق عطا فرمائے-

ایڈز کی تشہیر میں منفی انداز اختیار کیا جارہا ہے

مسعود مرزا محشر
باسط نگر، صوبہ داری، ہنمکنڈہ، ورنگل (آندھرا پردیش)

محترم خوشتر نورانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ...... دسمبر کا شمارہ ڈاک خانے کی نذر ہو گیا- اگر آپ کے پاس فاضل ہے تو روانہ کر دیجیے- آئندہ زرسالانہ کے ساتھ اضافی رقم ادا کر دوں گا- ''جام نور'' کا نشہ عدم دستیابی پر مضطرب کرتا ہے- یہی اس کے موثر ہونے کی دلیل بھی ہے- خانقاہی نظام کے غیر شرعی اور آمرانہ رویوں نے میرے دل ودماغ کو مکدر کر دیا تھا، سخت نفرت نے دیگر مسالک کی طرف راغب کر دیا تھا- لیکن وہاں بھی وجدانی کیفیت کے فقدان کی وجہ سے تسکین قلب کے اسباب مہیا نہ ہو سکے- گاہے گاہے ''جام نور'' کے مطالعہ سے دل کی تاریکیوں میں روشنی کے در کھلنے لگے- اب باقاعدہ ایک ہی نشست میں ''جام نور'' کا مطالعہ کرتا ہوں- میں تقابلی مطالعہ کا قائل ہوں- اس لیے مختلف ممالک کے رسائل زیر مطالعہ رہتے ہیں- برسبیل تذکرہ بات نکل آئی ورنہ اس تحریر کا مقصود تو کچھ اور ہی ہے-

فروری ۲۰۱۱ء کے شمارے میں ''حالات حاضرہ'' کے تحت جناب ذیشان احمد مصباحی صاحب کا مضمون ''عقیدہ حرکت میں'' باصرہ نواز ہوا- مرض ایڈس کی تشہیر پر کئی ہزار کروڑ خرچ کیے جارہے ہیں، اس کے باوجود یہ ایک بند باب ہے، جس کا وا ہونا ضروری ہے- تشہیر فائدہ مند اس لیے نہیں ثابت ہو رہی ہے کہ منفی انداز اپنایا جارہا ہے- مرض کے متاثرین کے ساتھ آج بھی ناروا سلوک کیا جارہا ہے- نفرت کی نگاہیں ہمیشہ تعاقب میں رہتی ہیں- ہر شخص بے راہ روی کی وجہ سے متاثر ہوا ہو یہ ضروری تو نہیں ہے؟ اس ضمن میں ایک واقعہ کا تذکرہ یقیناً تضیع اوقات کا باعث نہ ہوگا اور آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ سماج میں متاثرین کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے- ہمارے شہر سے تیس میل کے فاصلے پر ایک دیہات ہے- وہاں ایک غیر مسلم مزدور نے اپنی ۱۵ سالہ لڑکی کی شادی قریب کے دیہات کے نوجوان مزدور سے کردی، شادی کے دو سال بعد دولہا اس دنیا سے چل بسا- لڑکی والد کے گھر واپس آگئی، والد کا پیشہ سنگ تراشی تھا کفالت میں ہاتھ بٹانے کے لیے بیٹی بھی ساتھ جانے لگی- کام کرتے ہوئے ہاتھ پتھر سے زخمی ہو گیا، چوٹ گہری تھی، خون کی نسیں کٹ گئی تھیں، ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی، شہر کے اسپتال لایا گیا، آپریشن سے پہلے خون کا معائنہ کروایا گیا تو بدنصیب لڑکی H.I.V سے متاثر نکلی- ڈاکٹروں نے آپریشن کرنے سے انکار کردیا- اسی حالت میں گاؤں واپس آگئے کوئی زخم کا علاج کرنے کو تیار ہی نہیں تھا- علاج نہ کرنے کی وجہ سے زخم میں زہر سرایت کرگیا- بہت تکلیف ہونے لگی، دو دن میں بات سارے دیہات میں پہنچ گئی، لوگوں نے گھر کا مقاطعہ کردیا- باپ بے حد پریشان تھا لڑکی درد کی شدت سے زور زور سے چلا رہی تھی- لوگوں نے اس کی آواز پر بھی اعتراض کیا- آخر کار باپ نے ایک دن خوب نشہ کیا، کڑھائی میں تیل گرم کیا، کلہاڑی سے کہنی تک اس لڑکی کا ہاتھ قلم کیا اور پھر اسے گرم گرم تیل میں ڈبو دیا-

مقامی اخباروں میں تفصیل سے خبر شائع ہوئی، لیکن عوام نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا- حسب بالا واقعہ میں لڑکی کا قصور کیا تھا؟ ایسے کئی واقعات ہیں جنھیں تحریر کرنے لیے دفتر درکار ہیں- میں اب اصل مدعا کی جانب آتا ہوں- مغربی آقاؤں نے کہہ دیا کہ اس مرض کا کوئی علاج نہیں ہے تو ہمیں یقین کامل ہوگیا- ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا- کوئی مرض لاعلاج نہیں، اسے بھول گئے، دوا اور دعا دونوں کی جستجو تک نہیں کی گئی- پاکستان کی شاہ عبداللطیف یونیورسٹی کراچی کے فیکلٹی آف سائنس کے شعبہ مائکروبیالوجی کے تحقیق کار ڈاکٹر محمد رفیق نے بعض جڑی بوٹیوں سے ایک ایسی دوا تیار کی ہے جس سے ایڈز کے مریض کا بڑی آسانی سے علاج کیا جاسکتا ہے- اس دوا سے اب تک ۳۲ مریضوں کا علاج کیا جاچکا ہے-

محدث اعظم ہند نمبر کی اشاعت پر آپ شکریے کے مستحق ہیں

محمد ابرار علی مصباحی
استاذ: دارالعلوم رضویہ سلطانیہ، سرنکوٹ، ضلع پونچھ (جموں کشمیر)

مکرمی ایڈیٹر صاحب! سلام ورحمت...... اپریل ۲۰۱۱ء کا شمارہ جام نور (محدث اعظم نمبر) نظر نواز ہو، یقین کریں کہ جونہی خصوصی شمارہ پر اساتذۂ دارالعلوم رضویہ سلطانیہ کی نظر پڑی ان کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی، آپ کو بے حد مبارک باد! الحمد اللہ! اس خصوصی شمارے کے سارے مضامین پسند آئے، لیکن آپ کا اداریہ اور شیخ الاسلام حضرت علامہ محمد مدنی میاں، ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی، ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی اور مولانا ذیشان احمد مصباحی کے مضامین خصوصی طور پر اچھے اور اپنی مثال آپ ہیں، گویا سمندر کو کوزے میں بھر دیا گیا ہے، انہی مضامین کے ذریعہ ہمیں حضرت محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ کی خدمات وافکار اور معارف القرآن کی اہمیت کا اندازا ہوا- حضرت محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ کی سوانح حیات سے پہلے ہم ناآشنا تھے، لیکن آپ کی ٹیم کی کرم فرمائی ہے کہ آپ حضرات نے نہایت محنت وجاں فشانی سے اس نمبر کو ترتیب دیا، جس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا- اس اہم پیش رفت پر آپ تمام حضرات پوری جماعت کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں- ہندو پاک کی سرزمین پر ابھی ایسے بے شمار مشائخ ہیں جن کی اہم خدمات کو ہم فراموش کر چکے ہیں، ان کے تعارف اور خدمات کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، ان پر اب تک نہ کوئی کتاب لکھی گئی اور نہ ہی کسی رسالے کا خصوصی شمارہ سامنے آیا، جس کا بے حد نقصان اہل سنت و جماعت اٹھا رہے ہیں- اسی بات کو آپ نے بے حد اعتدال کے ساتھ اپنے اداریے میں ذکر کیا ہے، جو نہایت فکر انگیز ہے اور فکر وعمل کی دعوت دیتا ہے- میں آپ کی باتوں سے پورے طور پر متفق ہوں کہ ان تمام مشائخ کا ذکر و تعارف بھرپور انداز میں سامنے آنا چاہیے جنھوں نے اسلام اور سنیت کے لیے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ وقف کردیا تھا-

مسائل اور الجھنیں

قارئین جام نور اس کالم میں دینی، علمی، فکری، ادبی، تعلیمی، سائنسی، سیاسی اور سماجی مسائل سے متعلق اپنے سوالات/ الجھنوں کا جواب/حل حاصل کر سکتے ہیں-اس کے لیے قارئین اپنے سوالات مختصر لفظوں میں لکھ کر ادارے کے پتے پر ارسال کریں- (ادارہ)

عصری تعلیم اور خدمت دین- میں کیا کروں؟

سوال: میں جامعة الرضا بریلی میں زیر تعلیم ہوں ،میں چاھتاھوں که مدرسے کی تعلیم چھوڑ دوں اور عصری دانش گاھوں میں جاکر اسلامیات، تقابل ادیان، تاریخ اور اردو جیسے مضامین سے بی اے اور ایم اے کروں اور پھر اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام کروں-براے مھربانی میری رھنمائی فرمائیں که خدمت دین کے لیے میرے لیے کون سا سبجیکٹ زیادہ بهتر هوگا، اسلامیات، تقابل ادیان، تاریخ، اردو، عربی یا کچھ اور؟

محمد علی، جامعۃ الرضا سی بی گنج، بریلی (یوپی)

جواب: ایک زمانے تک مدارس کے طلبہ اور اساتذہ یونیورسٹیز سے متوحش رہے، تعلیم جدید کو کفر والحاد یا کم از کم فسق ونفاق کے مترادف تصور کرتے رہے-اس رویہ نے فی الجملہ اسلام اور مسلمانوں کا جو نقصان پہنچایا یہ الگ موضوع ہے-گزشتہ کچھ سالوں سے طلبہ مدارس یونیورسٹیز کی طرف متوجہ ہوئے، یہ توجہ کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں تھی-اب گزشتہ چند سالوں سے ایک نیا ظاہرہ سامنے آیا ہے-ارباب مدارس کی نظر میں مدارس کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی-طلبہ مجنونانہ انداز میں یونیورسٹیوں کا رخ کر رہے ہیں، انہیں نہیں معلوم کہ یونیورسٹیز میں پہنچ کر کیا کرنا ہے، مگر ان کی زبان پر ایک ہی نعرہ ہے کہ ہمیں ''عصری تعلیم'' حاصل کرنی ہے-چوں کہ ان کا سفر شعور کے تحت نہ ہو کر جنون کے تحت ہے، اس لیے نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اکثر طلبہ یونیورسٹیوں میں پہنچ کر بے سمتی، بے راہ روی یا احساس محرومی کا شکار ہو رہے ہیں-

آمدم بر سر مطلب! آپ کے لیے بہتر ہے کہ کسی بھی معیاری ادارے سے کم از کم عالمیت ضرور مکمل کر لیں اور اگر ممکن ہو تو فضیلت بھی، مدارس اپنے طلبہ کے اندر دینی علوم کا جو بنیادی جوہر پیدا کرتے ہیں یہ کسی طور پر یونیورسٹیوں میں ممکن نہیں ہے لیکن افسوس کہ جو گوہر گراں مایہ طلبہ مدارس کے ہاتھوں میں ہے انہیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں اور وہ بے ساختہ سنگ ریزوں اور ریگ زاروں کی طرف بھاگتے جا رہے ہیں-اگر اسلامی نقطۂ نظر سے آپ تعلیمی اور تبلیغی سطح پر کچھ کام کرنا چاہتے ہیں تو مدارس کی تعلیم کو ضرور مکمل کیجیے، وہ تعلیم اس راہ میں آپ کے لیے بہت سی منزلیں طے کرا دے گی ، اس کے بعد کچھ مسافتیں رہ جائیں گی جو یونیورسٹیز میں پہنچ کر آسان ہو جائیں گی-بلفظ دیگر مدارس کی تعلیم اسلامی تفکیر وتحقیق کی عمارت کی مضبوط ستون اور دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں جس پر یونیورسٹیز میں پہنچ کر چھت کی تکمیل اور تزئین وآرائش کا کام بہ آسانی مکمل ہو جاتا ہے بصورت دیگر کمزور بنیادوں پر کھڑی ہونے والی عمارت کس قدر ناپائیدار ہوتی ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے-

محب گرامی! آپ نے یہ بھی خوب دریافت کیا کہ "خدمت دین کے لیے میرے لیے کون سا سبجیکٹ بہتر ہوگا، اسلامیات، تقابل ادیان، تاریخ، اردو، عربی یا کچھ اور؟'' یہ فیصلہ اپنی شخصیت، تعلیمی واقتصادی پس منظر اور فطری ذوق کو سامنے رکھ کر آپ کو ہی لینا پڑے گا-طلبہ عموماً اس طرح کے سوالات کرتے ہیں جب کہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی بھی سبجیکٹ برا نہیں ہے-انتخاب اس بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا کہ کون زیادہ بہتر اور کون غیر مناسب ہے، یہ فیصلہ ہر طالب علم کے اپنے ذوق ومزاج پر انحصار کرتا ہے-مدارس سے فراغت کے بعد تک طلبہ اس طرح کے سوالات کرتے رہتے ہیں جس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ فراغت کے بعد تک ان کا ہدف متعین نہیں ہوتا، انہیں اپنی زندگی میں خصوصی طور پر کیا کرنا ہے، اس کا علم انہیں نہیں ہوتا اور وہ ''عصری تعلیم'' اور ''خدمت دین'' جیسے مبہم اور عام الفاظ کے پیچھے چلتے رہتے ہیں-

''ہدف کا تعین'' کامیابی کا پہلا زینہ ہے اور مدارس سے فراغت کے بعد تک اس زینے کا علم نہ ہونا شرم ناک حد تک قابل افسوس ہے۔ آج اختصاص کا دور ہے۔ ہر فن کے پچاس گوشے سامنے آگئے ہیں جن گوشوں میں سے کسی ایک کے کسی ایک موضوع پر عموماً آج کا اسکالر اپنی زندگی تمام کر دیتا ہے۔ ایسے میں طلبہ مدارس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ذوق اور تعلیمی واقتصادی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے شروع سے ہی اپنا ہدف متعین کرلیں، اس کے لیے ان کے اساتذہ بھی ان کی مناسب رہنمائی فرمائیں اور پھر اس ہدف تک پہنچنے کے راستوں کی معلومات حاصل کریں اور پھر ان راستوں پر چلنے کا عزم مصمم لے کر اٹھیں اور کبھی پلٹ کر پیچھے نہ دیکھیں، کامیابی ان کے قدموں پر ہوگی، ان شاء اللہ! اس کے لیے معروف ماہر نفسیات ڈیل کارنیگی کی کتاب ''کامیابی کے راستے'' مطبوعہ ادبی دنیا، مٹیا محل جامع مسجد دہلی، سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

ہم نے ''عصری تعلیم'' اور ''خدمت دین'' کو مبہم اور عام الفاظ کہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اولاً ''عصری تعلیم'' کی اصطلاح سے ہی پورے طور سے اتفاق نہیں ہے کیوں کہ ہمارے خیال میں ''عصری تعلیم'' کا صحیح مفہوم ''یونیورسٹی کی تعلیم'' کی بجائے ''عصر حاضر کے لیے مفید تعلیم'' ہونا چاہیے، اس صورت میں مدارس کی تعلیم (قرآن، حدیث، فقہ، عقائد، فلسفہ، اور ایک حد تک سائنس، سیاست، کمپیوٹر) بھی اسی طرح عصری ہے جس طرح کسی بھی یونیورسٹی کے نصاب کا کوئی بھی سبجیکٹ عصری ہوسکتا ہے۔ قرآن وحدیث اور فقہ وفتاویٰ کا مطالعہ اس طور پر کرنا کہ کٹی پتنگ کی مانند آج کے انسان کی ایمانی، روحانی اور نفسیاتی رہنمائی ہوسکے، یہ عصری تعلیم نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مدارس کی تعلیم کو عصری دینی وشرعی مطالبات سے مزید جوڑنے کی ضرورت ہے لیکن انہیں سرے سے عصری تعلیم کے دائرے سے خارج کرنا ہرگز انصاف نہیں ہے۔ اسی طرح کمپیوٹر آپریٹنگ، پینٹنگ اور امبراڈری کی تعلیم کو عصری تعلیم کہنا بھی ہمارے نزدیک کسی خوب صورت مضحکے سے کم نہیں ہے، انہیں عصری تعلیم کی بجائے روزگار کی تعلیم کہنا زیادہ موزوں ہے۔

اور اگر ''عصری تعلیم'' کا مفہوم ''یونیورسٹی کی تعلیم'' فرض بھی کرلیا جائے جب بھی یہ وضاحت ضروری ہے کہ یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے سیکڑوں علوم وفنون میں سے کوئی کون سا علم یا فن پڑھنا چاہتا ہے، صرف عصری تعلیم کہنا کافی نہیں ہے۔

''خدمت دین'' کا لفظ بھی یقیناً ایک مبہم لفظ ہے۔ خدمت دین کے پچاس طریقے ہیں، کسی بھی شخص کو پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ وہ ان طریقوں میں سے کون سے طریقے سے خدمت کرنا چاہتا ہے، یہ فیصلہ ذاتی صلاحیت اور اسباب ووسائل کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے، اس کے بعد پھر اس طریقے سے بہتر سے بہتر انداز میں کیسے کام کیا جائے، اس کی جستجو اور فکر ہونی چاہیے، ایک مثال سے اس کو یوں سمجھیے کہ ایک طالب علم ہے جو کہتا ہے کہ میں قلم سے خدمت دین کرنا چاہتا ہوں تو اتنا کہہ دینے سے بھی اس کی بات پوری نہیں ہوتی۔ اسے یہ بھی طے کرنا پڑے گا کہ وہ قلم کے ذریعے ایک صحافی بننا چاہتا ہے یا مورخ بننا چاہتا ہے، صحافی بننا چاہتا ہے تو کس نوعیت اور سطح کا، مورخ بننا چاہتا ہے تو تاریخ کے کس پہلو پہ کام کرنا چاہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر شکیل اعظمی کو اعزاز

معروف شاعر وادیب ونقاد جناب ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب کے نعتیہ مجموعۂ کلام ''گل قدس'' اور منقبتی مجموعۂ کلام ''حرف ثنا'' کی رسم اجرا ۵ مئی ۲۰۱۱ء کو عرس حافظ ملت کے مبارک موقع پر جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ کے گراؤنڈ میں ادا کی جائے گی اور اسی موقع پر انہیں ''حافظ ملت ایوارڈ'' اور توصیف نامے سے سرفراز کیا جائے گا اور پھر ۱۹ر مئی ۲۰۱۱ء کو گھوسی ضلع مئو میں کل ہند نعتیہ مشاعرہ بسلسلۂ جشن ڈاکٹر شکیل اعظمی بطور اعزاز وتہنیت منعقد ہوگا، جس میں ملک کے معروف نعت گو شعرائے کرام اور اساتذۂ علم وفن شرکت فرمائیں گے۔ مشاعرے کی صدارت پدم شری بیکل اتساہی فرمائیں گے جب کہ نظامت کا فریضہ جناب آصف رضا سیفی انجام دیں گے۔ مفتی محمد نظام الدین رضوی، مولانا اسید الحق عاصم قادری، مولانا خوشتر نورانی اور مولانا مبارک حسین مصباحی مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوں گے۔ اس موقع سے ڈاکٹر اعظمی کی خدمت میں مولانا خوشتر نورانی ''توصیف نامہ'' پیش کریں گے جب کہ تنظیم شعرائے اہل سنت کی جانب سے ''خوشبوئے حسان ایوارڈ'' پیش کیا جائے گا۔

از: ڈاکٹر سہیل انور اعظمی کریم الدین پور گھوسی ضلع مئو

ARY Q.tv کے بین الاقوامی شہرت یافتہ نقیب

محترم صاحبزادہ تسلیم احمد صابری سے ملاقات

خوش رو، خوش قامت، خوش باش، خوش پوش، خوش فکر، خوش مزاج، خوش کلام اور خوش انداز جیسے لفظوں کے خوش تر امتزاج سے معاصر اردو مذہبی دنیا کے برقی کینوس پر صرف ایک ہی تصویر ابھرتی ہے اور وہ تصویر ہے لفظوں سے جادو جگانے والے، نعتیہ محافل کے بین الاقوامی نقیب، ممتاز اینکر، تحت لفظ کے منفرد ثنا خوان رسول، لاکھوں دلوں کی دھڑکن، مذہبی افق کے تابندہ ستارے، پیکر صبر و تسلیم، محب گرامی صاحب زادہ تسلیم احمد صابری کی- تسلیم صابری نے کراچی کے اندر ایک مذہبی روحانی آغوش میں اپنی آنکھیں کھولیں جہاں میاں جی حضرت سید محمد عبداللہ شاہ قادری چشتی علیہ الرحمۃ والرضوان کی ڈیوڑھی پر سحاب چشتیت و قادریت جھما جھم برس رہا تھا- اس بارش رحمت میں تسلیم صابری بھی جی بھر کے نہائے- تسلیم صابری کے والد گرامی حضرت محمد عادل صابری حضرت میاں جی کے جانشیں اور صاحب سجادہ ہیں- تسلیم صابری کا جوہر گفتار اس وقت سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے جب وہ اسکول کے طالب علم تھے- اسی دور میں انہوں نے خطابت کے متعدد ایوارڈز اور ٹرافی جیتے- and Accounting Finance میں پوسٹ گریجویشن کے بعد انہوں نے مختلف صنعتی اداروں میں ملازمت کی- ۱۹۹۰ء کے بعد نعتیہ محافل کی باضابطہ نظامت شروع کی، پھر P.tv پر اپنا جلوہ بکھیرا اور بعد ازاں ۲۰۰۴ء میں جب Q.tv کا افتتاح ہوا تو وہ Q.tv کے ممتاز نقیب اور میزبان بن کر سامنے آئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن گئے- اس کے ساتھ تحت لفظ کے منفرد انداز میں ان کی مدح سرائیوں پر مشتمل دو سی ڈیز ''تسلیمات'' اور ''تسلیم و رضا'' کے نام سے بے پناہ مقبول ہوئیں- کچھ ماہ پہلے محب گرامی مولانا اسید الحق قادری کے ساتھ دورۂ پاکستان کے موقع پر موصوف سے لیا گیا خصوصی انٹرویو قارئین کی خدمت میں حاضر ہے ——— **خوشتر نورانی**

جام نور: -آپ کے نام کے ساتھ 'صاحبزادہ' اور 'صابری' کے لاحقہ اور سابقہ ہیں- ان کی مناسبت کیا ہے؟

تسلیم احمد صابری: -میرے نانا اور پیر و مرشد حضرت سید محمد عبداللہ شاہ قادری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق امروہہ، یوپی (انڈیا) سے ہے، جن سے میں بیعت ہوں اور وہ حضرت علاؤ الدین صابر پاک کی نسبت سے ''صابری'' لکھتے تھے اور میرے والد سجادہ نشین ہیں- اس لیے لوگ مجھے ''صاحبزادہ'' اور ''صابری'' لکھتے اور کہتے ہیں-

جام نور: -نظامت اور شعر و سخن کی طرف آپ کا رجحان کب سے ہوا؟

تسلیم احمد صابری: -یہ بات ہے کوئی ۹۲/۹۱ کی- میرے پیر و مرشد میرے نانا حضرت سید محمد عبداللہ شاہ قادری چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو نعت پاک سے کافی شغف تھا اور میرے گھر کا ماحول بھی دینی تھا- میرے نانا کے زمانے میں گھر میں نعتیہ محافل ہوا کرتی تھیں جن میں پاکستان کے اکثر نعتیہ شعرا تشریف لایا کرتے تھے- ان محافل کا میں بھی حصہ ہوا کرتا تھا- یہ میرے لیے شرف کی بات تھی اور میرے نانا یہ چاہتے بھی تھے کہ میں نعت سے منسلک ہو جاؤں، اس لیے وہ مجھ سے بھی نعت پڑھایا کرتے تھے- پاکستان میں ایک نعت کالج ہے- علامہ ریاض الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی نعت کے حوالے سے کافی خدمات ہیں- ان ہی کے صاحبزادہ وہ کالج چلایا کرتے تھے- اس میں نانا نے مجھے بھیجا- میں وہاں ایک ڈیڑھ مہینہ گیا بھی- پھر میرے کرم فرما جناب اکرم مجاہد نے بارہا مجھ سے کہا کہ تم بھی محافل میں شریک ہوا کرو- تمہاری آواز اچھی ہے- اس لیے میں بھی محافل میں شریک ہونے لگا- بعد میں انہی کے مشورہ سے نظامت کی شروعات کی- پاکستان میں نظامت کے حوالے سے ایک بڑا نام شہریار قدوسی کا ہے- اس فن میں ان کا بڑا نام ہے- ان کے اشعار کو یاد کر کے اور انہیں سن کر میں نے بھی نظامت شروع کی- بعد میں ایسا وقت بھی آیا جب مجھے لگا کہ مجھے اپنی تیاری کرنی چاہیے اس لیے میں نے ان کی چیزیں ضائع کیں اور اپنی تیاری شروع کر دی- اپنے مزاج کے اعتبار سے آغاز کیا- مجھے یاد آتا ہے کہ جب اکرم مجاہد نے مجھے نظامت کا مشورہ دیا تھا اس وقت میں نے ان سے کہا تھا کہ اسٹیج پر علما بیٹھے ہوتے ہیں، مجھے اس فن کا اندازہ

نہیں ہے- میں کس طرح نظامت کرسکتا ہوں- کہیں کوئی گستاخی ہوجائے وغیرہ مگر آہستہ آہستہ وہ معاملہ چل نکلا-

جام نور: -ٹیلی ویژن بالخصوص Q.tv سے وابستگی کب ہوئی؟

تسلیم احمد صابری: -پاکستان کا سرکاری چینل P.tv ہے اس پر میں نعتیہ محافل اور دیگر علمی وفکری پروگرامز میں بھی آچکا تھا- یہ بھی اتفاق ہی کہیں کہ ARY پر میں نعتیہ محافل میں بھی شریک ہوا تھا- اس وقت Q . tv کی بنیاد نہیں رکھی گئی تھی- پھر Q.tv کا اجرا ہوا- اس کا اجرا حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مناقب پرمبنی پروگرام سے ستمبر ۲۰۰۴ء میں ہوا، اس پروگرام کو میں نے ہی Conduct کیا تھا- مجھے یہ بھی شرف حاصل ہوا کہ Q.tv کا اجرا اور پروگرام کا آغاز میری زبان سے ادا ہونے والے تسمیہ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' سے ہوا- مختلف چینلوں پر میرے تمام پروگرام دراصل انہیں نعتیہ محافل، نعت خوانی اور محافل کی نظامت کی دین ہیں-

جام نور: -تحت لفظ میں شعر ادا کرنے کا آپ کا نرالا انداز ہے جس کی وجہ سے آپ کی شہرت پوری دنیا میں ہے- یہ انداز آپ کی ایجاد ہے یا آپ نے کسی دوسرے سے اخذ کیا ہے؟

تسلیم احمد صابری: -تحت لفظ کی روایت کافی پرانی ہے- P.tv میں بھی اس کا بڑا عمل دخل تھا- مراثی اور نعت یعنی مختلف اصناف سخن اس میں پیش کی جاتی تھیں- شہریار قدوسی اور ضیامحی الدین کو پاکستان میں تحت لفظ کے حوالے سے کافی شہرت تھی- میں نے تحت لفظ میں تصنع اور بناوٹ کو جگہ نہیں دی- یہی میرا اہتمام تھا- لحن اور نغمگی میں بڑی کشش ہوتی ہے- اس سے ہم سب متاثر ہوتے ہیں-

جام نور: -آپ جب اشعار کو تحت لفظ میں پڑھتے ہیں تو ناظرین اسے بے پناہ پسند کرتے ہیں اور بعض اوقات یہ فیصلہ نہیں کرپاتے کہ اصل خوبی شاعر کی ہے یا ثناخواں کی- آپ شعروں کے انتخاب کے سلسلہ میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟

تسلیم احمد صابری: -میں نے اشعار کے انتخاب میں ایک سیدھا سادہ فارمولہ رکھا ہے کہ جو اشعار مجھے اچھے لگیں اس کی لطافت مجھے دوسروں تک پہنچانی ہے- اس کا قائل ہونے کے باوجود کہ تشریح سے اشعار کا لطف جاتا رہتا ہے، بعض دفعہ میں نے اشعار کے مفاہیم کو عوام تک منتقل کرنے کے لیے تشریح کی- میں نے نقابت میں روایت بندی کا اہتمام بھی کیا- شعر میں شعر کی گرہ بندی پھر شعر در شعر میں گرہ بندی کی اور روایت کا اتصال بھی- ان چیزوں نے ایک حسن پیدا کیا اور شعر کی توقیر بڑھی-

جام نور: -Q.Time میں ایک مرتبہ پروفیسر طاہر القادری سے انٹرویو کے دوران آپ نے یہ کہا تھا کہ مجھے بولنے کا سلیقہ قادری صاحب سے ملا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟

تسلیم احمد صابری: -حضور میاں قبلہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (میرے پیرومرشد اور نانا) کے پاس بہت بڑی بڑی شخصیات تشریف لاتی تھیں- ان میں ڈاکٹر طاہر القادری صاحب بھی شامل ہیں- جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اس وقت میں سن شعور کو پہنچ چکا تھا- ملاقات میں میں شریک تھا- نانا جان نے ڈاکٹر صاحب کے لیے اچھے الفاظ کہے- میں نے ان کو بہت سنا ہے اس لیے میرے دل میں ان کے لیے عزت بھی ہے اور آج بھی میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ان ہی کے طرز خطابت سے مجھے تحریک ملی- گو کہ میرے اور ان کے انداز میں کافی فرق ہے میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ میں تصنع سے خود کو الگ رکھوں- آپ محسوس کریں گے کہ میں ٹیلی ویژن پر بھی اسی طرح بولتا ہوں جیسا ابھی آپ کے سامنے بول رہا ہوں-

جام نور: -Q.tv کے ذریعہ نشر کیے جانے والے اسلامی پروگراموں سے براہ راست آپ کو کیا ایسے تجربات ہوئے جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ Q.tv کے ذریعے اسلامی ماحول بن رہا ہے؟

تسلیم احمد صابری: -یقیناً عوامی مسائل عوام تک پہنچے، فقہی مسائل حل ہوئے، نعت کا ذوق عوام میں پیدا ہوا، گھر گھر ہمارے مفتیان کرام نے زندگی کے مسائل پہنچائے، اس میں Q.tv کا بڑا اہم کردار رہا ہے- اس سے ماحول بنا اور اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اس کام کے لیے مجھے بھی منتخب کیا-

جام نور: -کہا جاتا ہے کہ ٹیلی ویژن سے جو نعتیں اور تقریریں نشر ہوتی ہیں ان میں تصنع بہت ہوتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

تسلیم احمد صابری: -جی درست ہے- جہاں بہت سارے فوائد ہوتے ہیں وہاں چوں کہ بہت سارے افراد ہوتے ہیں اس سے بہت ممکن ہے کہ ایسا ہوتا ہو- بہت سارے لوگوں کی میرے سلسلہ میں بھی یہ رائے ہوگی- اسے یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا- میں

لوگوں کی رائے کا احترام کرتا ہوں-

جام نور: -علمائے اہلِ سنت اور عوام کا ایک بڑا طبقہ ہے جو ٹیلی ویژن پر خواتین کی پیش کش یا ان کا Ultra Modern - Make up پسند نہیں کرتا- کیا اس طرح کا کوئی ردعمل آپ کے آفس تک پہنچا- اگر ہاں! تو اس پر Q.tv کے ذمہ داران کا ردعمل کیا رہا؟

تسلیم احمد صابری: -یقیناً اس طرح کی باتیں آفس تک پہنچی ہیں اور اس پر Q.tv کے ارباب حل وعقد نے اپنے اقدامات بھی کیے ہیں- دیکھیے جہاں تک بہت زیادہ بناؤ سنگار کی بات ہے تو یہ تو اپنی جگہ قابل غور مسئلہ ہے، رہا یہ کہ خواتین کو ٹیلی ویژن پر آنا چاہیے یا نہیں آنا چاہیے، اس تعلق سے میں کچھ خاص عرض نہیں کرسکتا، میں کوئی عالم دین نہیں ہوں اور اس مسئلے پر اظہار خیال کرنا علما کا منصب ہے- یہ ایک علمی وفقہی بحث ہے جس میں میں زبان درازی کی جرأت نہیں کرسکتا لیکن میں ایک بات یہاں اس سے ہٹ کر یہ عرض کروں گا کہ آج ہمارے سامنے میڈیا کا عفریت ہے جو برائی کی دعوت دے رہا ہے، ہم اس کے مقابل کھڑے ہوکر، اپنی سی کوشش کرکے، اچھائی کی دعوت دینے کی کوشش کررہے ہیں- اس میں ہم کتنا کامیاب ہورہے ہیں یہ الگ سوال ہے، لیکن یہ بات تو اپنی جگہ طے ہے کہ جب تک آپ لوگوں کو ایک خیر کا آپشن نہیں دیں گے- برائی کو چھوڑنے کے ساتھ اچھائی کا کوئی موقع نہیں دیں گے، اس وقت تک دعوت خیر کا امکان کیسے پیدا ہوسکے گا- ہماری رائے ہے کہ ہر جہت پر، ہر محاذ پر برائی کا مقابلہ ہونا چاہیے- خواتین کے پروگرام کو اگر اس جہت سے دیکھا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ خواتین کا پروگرام بہت ضروری ہے- خواتین کے پروگرام کو خواتین زیادہ توجہ سے دیکھتی ہیں اور خواتین کے مسائل خواتین کے ذریعے جب بیان ہوتے ہیں تو وہ زیادہ موثر اور ان کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں-

جام نور: -Q.tv کے ذریعہ جو کام ہوا ہے اس سے بڑے حلقے میں اسلام اور سنیت کی اشاعت ہوئی لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود کچھ اپنے لوگ ہی اسے صرف منفی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں؟

تسلیم احمد صابری: -ہاں! کچھ اطلاعات اس سلسلے میں ملی ہیں کہ بعض حضرات اس کو پسند نہیں کرتے اور پسند نہ کرنے کی وجہ ان کی اپنی Justifications ہوں گی- ممکن ہے شاید ہم ان کے معیار پر اپنا کام نہ کرپارہے ہوں- ان کا معیار ہم سے بہت اعلیٰ ہو- اگر ایسی کوئی بات ہے تو ہم اس کا احترام کرتے ہیں- اس کے علاوہ بھی جو ان کی باتیں یا اعتراضات پیش کش کے حوالے سے یا نمائندگی، مواد یا افکار کے حوالے سے ہیں وہ ہم تک پہنچائیں، ہم ان پر غور کرنے اور اپنا محاسبہ کرنے کے لیے تیار ہیں-

جام نور: -نعت کے تعلق سے پاکستان میں جو نئی بیداری اور جو پروفیشنل ازم آیا ہے، اس نے پورے منظر نامے کو تبدیل کرکے رکھ دیا ہے، اس کے مثبت اور منفی پہلو آپ کی نظر میں کیا ہیں؟

تسلیم احمد صابری: --جس وقت میں انٹرمیڈیٹ کررہا تھا اس وقت ہر نوجوان انجینئر یا ڈاکٹر بننا چاہ رہا تھا، جس وقت میں B.Com کرچکا تھا اس وقت Finance and account کے شعبے کی بہت اہمیت ہوگئی تھی، یہ دور ایسا ہے جس میں Mass Communication and Journalism کی بہت زیادہ اہمیت ہے- چوں کہ یہ میڈیا کے تسلط اور غلبے کا عہد ہے- ٹیلی ویژن پر جس طرح بہت سی دوسری چیزوں کا فروغ ہوا وہیں اس کے ذریعہ نعت رسول مقبول ﷺ کا بھی بے انتہا فروغ ہوا اور اس توسط سے نبی کریم ﷺ کی محبت کو گھر گھر پہنچایا گیا-

اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ جو نعت خواں حضرات تھے ان کی بے پناہ پذیرائی ہوئی- ہر طرح کی پذیرائی، انہیں عزت وشہرت ملی اور گراں قدر نذرانوں سے انہیں نوازا گیا- اب ایسے میں بہت ممکن ہے کہ اس میدان میں کچھ لوگوں نے صرف پیسے کے لیے قدم بڑھایا ہو اور یہ تو ہوتا ہی ہے کہ جب آپ مواقع فراہم کرتے ہیں تو وہاں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں اچھے لوگ بھی اور برے لوگ بھی، کوئی بھی شعبہ ہو، ہر جگہ یہ بات آپ کو دیکھنے میں آئے گی- آپ کا تعلق صحافت سے ہے آپ کا رسالہ جام نور ملک وبیرون ملک پڑھا جاتا ہے- ہر جگہ صحافت کا تصور بھی موجود ہے، لیکن خود اس میدان میں بھی ہر طرح کے لوگ موجود ہیں- آخر جہاں صحافت کی بہت سی مدح سرائی ہوتی ہے وہیں ہمارے یہاں زرد صحافت کا تصور بھی تو موجود ہے- یہ بات نعت خوانی کے میدان میں بھی نظر آسکتی ہے- کچھ لوگ ایسے ہوسکتے ہیں لیکن جو معیار کا خیال نہ رکھتے ہوں، ان کا انداز ایک دم بازاری ہو اس کی وجہ سے نعت خوانی کی اس بڑھتی مقبولیت پر نشتر نہیں چلایا جاسکتا جو فی الجملہ عشق رسول کی اسپرٹ عام کررہی ہے-

جام نور: -آپ ہندوستان بھی جا چکے ہیں اور ہندوستان میں جو نعت خوانی کا انداز ہے آپ نے اسے بھی ملاحظہ فرمایا ہے، وہاں نعتیہ محفلوں کی نظامت بھی فرمائی ہے، آپ بتائیں کہ ہند و پاک کی نعت خوانی میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟

تسلیم احمد صابری :- میں وہاں کی نعت خوانی پر بہت زیادہ تبصرہ نہیں کر سکتا- اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس وقت ہمیں اسٹیج پر بلایا جاتا ہے اس وقت عام طور پر اصل پروگرام شروع ہو جاتا ہے، جب بھی مجھے وہاں نظامت کے لیے مائک دیا گیا، اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے مقامی نعت خوانوں کو دعوت دینے کو نہیں کہا گیا بلکہ مہمان نعت خوانوں کو ہی بلانے کو کہا گیا، اس لیے میں دونوں ملکوں کے نعت خوانوں میں تقابل نہیں کر سکتا- ہو سکتا ہے کہ وہاں بہت اچھے نعت خواں ہوں، مجھے امید بھی ہے اور میں اس کے لیے دعا گو بھی ہوں لیکن میں تقابل کرنے سے قاصر ہوں- البتہ نعت سننے والوں اور پسند کرنے والوں کی بات کی جائے تو ہندوستان میں جتنا کچھ میں نے دیکھا، ممبئی میں مختلف محافل نعت میں شریک ہوا، اجمیر میں، دہلی میں، مارہرہ میں، تو میں نے محسوس کیا کہ اس حوالے سے ہندوستانی عوام کا ذوق بہت بلند ہے- وہ بہت محبت سے نعتیں سنتے ہیں، لیکن جہاں تک میں نے محسوس کیا کہ نعت کی جتنی محافل کا انعقاد ہونا چاہیے وہاں نہیں ہوتا-

جام نور: -نعت خوانی اور خصوصاً نقابت کے حوالے سے آپ کو عالم گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہے، ایسے میں آپ خود کے بارے میں کیا احساسات رکھتے ہیں، یعنی خود کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

تسلیم احمد صابری :- (ہنستے ہوئے) میں الحمد اللہ طالب علم کے مقام پر پہنچ گیا ہوں میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا نقیب ہوگا جس کو نقابت کے لیے خصوصاً محافل نعت کی نقابت میں پوری دنیا میں اتنا بلایا گیا ہوگا، میں بہت سی جگہوں پر جا چکا ہوں، لیکن ابھی بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی بہت سی جگہیں ہیں، بہت سے مواقع ہیں اور بہت سے طریقے ہیں جہاں پر مختلف انداز سے ابھی مزید کام کرنے کی ضرورت ہے-

جام نور: -پوری دنیا میں اپنی بے پناہ مقبولیت و شہرت اور اپنے مداحوں کی محبت کو دیکھ کر آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے؟

تسلیم احمد صابری :- بہت اچھا محسوس ہوتا ہے، وہ شخص عجیب ہوگا جو محبتوں کو پسند نہیں کرتا ہوگا، پوری دنیا سے جو لوگ بھی ملتے ہیں، بہت ہی محبت سے ملتے ہیں، اپنی محبتوں اور کلمات تحسین سے نوازتے ہیں- ٹیلی ویژن کے ایک عام اسٹار کی شہرت جو اسے کسی فلم کے ذریعہ، یا کسی ڈرامے کے کردار کے ذریعے ملی ہو اور ہماری شہرت میں بہت زیادہ فرق ہے- لوگ ہم سے عزت و احترام سے ملتے ہیں جس کے ہم قابل بھی نہیں ہیں-

جام نور: -Q.tv کے ذریعے جو کچھ کام ہوا وہ تو اپنی جگہ لیکن مزید سے مزید تر کی تلاش میں آپ لوگ کن باتوں کی کمی محسوس کرتے ہیں یا جن کو اپنے پروگرام کے اندر مستقبل میں شامل کرنا چاہتے ہیں؟

تسلیم احمد صابری :- بہت زیادہ جہتیں ہیں- سب سے بڑھ کر یہ خلا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اہلِ علم و دانش کا ایک بڑا طبقہ ہے جسے ٹیلی ویژن پر مواقع ملنے چاہیے، اس سے کام کی بہت سی نئی جہتیں سامنے آئیں گی، آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ آپ جب Q.tv اسکرین پر آئے ہیں تو پاکستان کا وہ طبقہ جو آپ سے محبت کرنے والا ہے اور جو مولانا اسید الحق کا قدرداں ہے اس کو کس طرح خوشی محسوس ہوئی ہے، وہ ہم سے مزید قریب ہوا ہے- کام ایک ہی ہے، آپ جام نور کے ذریعے کریں، میں Q.tv کے ذریعے کروں، اسید الحق صاحب اور آپ اپنے علمی افکار کے ذریعے کریں، مقصد سب کا ایک ہی ہے-

جام نور: -جام نور اور اس کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

تسلیم احمد صابری :- جام نور کا جو تعارف مجھ تک پہنچا ہے وہ سید صبیح رحمانی کے ذریعے پہنچا- اگر صبیح رحمانی کسی چیز کی تعریف کر رہے ہیں تو یقیناً وہ بہت ہی لاجواب چیز ہوگی- اس مرتبہ میں نے Q.tv پر بار بار آپ لوگوں سے اس کے بارے میں گفتگو بھی کی- مولانا اسید الحق قادری صاحب کی خامہ تلاشی پڑھی، آپ کے بعض اداریے پڑھے اور انٹرنیٹ پر جام نور کے بعض مضامین بھی پڑھے تو بے پناہ مسرت ہوئی- جام نور بہت بڑا علمی کام انجام دے رہا ہے- خصوصاً ایسے دور میں جو الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے- پرنٹ میڈیا میں ایسے علمی رسالے کا نکالنا، مقبول ہونا، اپنا مقام بنانا اور اپنے معیار کو برقرار رکھ کر مزید نئے آفاق فتح کرنا بہت بڑی بات ہے- اس کام کو انجام دے کر آپ نے یہ فکر بھی دی کہ اس جہت سے بھی کام ہو سکتا ہے- اس کے لیے میں آپ کو اور جام نور کی پوری ٹیم کو بہت مبارک باد پیش کرتا ہوں-□□□

جہان ادب

علامہ ارشد القادری کی واقعہ نگاری: ایک مطالعہ

بدر محمدی ☆

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کا عہد حصول آزادی اور تقسیم ملک کے بعد کا وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی سیاسی، سماجی، قومی اور ملی زندگی زبردست انقلاب سے دوچار تھی- ایسے میں مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی بہبودی کے ساتھ مذہبی بیداری بھی ضروری تھی چنانچہ علامہ ارشد القادری نے ایمان افروز، روح پرور اور پاکیزہ کہانیوں کا لٹریچر ہاتھوں میں دے کر ان نوجوانوں کا ذہن بدلنا چاہا جو گندے ناولوں اور شہوت انگیز افسانوں کو پڑھ کر اپنا قیمتی وقت اور صلاحیت برباد کرنے نیز زندگی کو غلط راہ پر لگا کر مستقبل کی تباہی مول لینے میں مصروف تھے- پھر یہ کہ جن مسلمانوں کو دینی کتابوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اور وہ اپنی بدذوقی کی وجہ سے مذہبی کتابوں کے مطالعے سے محروم تھے انہیں حکایات کی زبان میں دین سے روشناس کرانے کی علامہ نے موثر ترکیب نکالی، وہ یہ کہ جام کوثر اور جام نور کلکتہ کے ہر شمارے میں انہوں نے ''بزبان حکایت'' ایک مستقل عنوان قائم کیا اور اس کے تحت خیر و سعادت کی ترغیبات پر مشتمل ایسے قصے پیش کرنا شروع کیے جو روحوں کی تطہیر، دلوں کی تسکین اور دینی امنگوں کی تشکیل کا ذریعہ ثابت ہوئے- بتایا جاتا ہے کہ ان اثر انگیز کہانیوں کو پڑھ کر بہت سے نوجوانوں کا مزاج بدل گیا، روحوں میں طہارت و پاکیزگی کی طرف بڑھنے کی جستجو پیدا ہوئی یہاں تک کہ عشق و ایمان کے سوز و گداز نے کچھ لوگوں کو اندر سے اتنا تبدیل کر دیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے- دراصل علامہ نے اپنے قارئین کے ذوق مطالعہ اور ذہنی رجحانات کے ذریعے اس امر کا مشاہدہ کیا کہ درس و ہدایت کے انداز میں جو باتیں کہی گئیں ان کے حلق کے نیچے اترنے میں دیر لگی لیکن وہی باتیں جب قصص و حکایات کے پیرائے میں بیان کی گئیں تو انہی طبیعتوں نے بہت جلد قبول کر لیا-

علامہ ارشد القادری اپنی واقعہ نگاری کی مقبولیت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس زمانے میں جام نور کا تازہ شمارہ ہاتھ میں آنے کے بعد قاری سب سے پہلے ''بزبان حکایت'' کا صفحہ تلاش کرتا تھا- ایک شمارے میں اس کالم کے نہیں شائع ہونے پر دفتر میں شکایتی خط کا ڈھیر لگ گیا تھا-'' علامہ مزید تحریر فرماتے ہیں کہ- ''ملک کے طول و عرض میں جام نور کے قارئین شائع شدہ کہانی کو پڑھ کر لوگوں کو سنایا کرتے تھے-'' واقعہ یہ ہے کہ ان تاریخی کہانیوں کی معنویت اور مقبولیت تب بھی تھی اور آج بھی ہے- اپنی تازگی ہمیشہ برقرار رکھنے والی یہ کہانیاں یک جا ہو کر ''لالہ زار'' کی کتابی شکل اختیار کر چکی ہیں اور اس کتاب کے کئی ایڈیشن اشاعتی مرحلے سے گزر چکے ہیں- بہر کیف! لالہ زار عشق و ایمان کی حرارت سے دلوں کو پگھلا دینے والی ان سترہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جنہیں پڑھ کر کردار و عمل کو فعال کرنے والی عبرت و نصیحت سے بہرہ ور ہوا جا سکتا ہے- ظاہر ہے کہ یہ قصے وقت گزاری کے لیے نہیں بلکہ دعوت اسلامی کے لیے ہیں- عام طور پر گھر کے سن رسیدہ افراد قصے کہانی کہا کرتے ہیں- علامہ ارشد القادری ہمارے لیے برگزیدہ ہستی تھے اور قوم کے ناصح بھی- اگر حصول سبق کے اعتبار سے لالہ زار کی کہانیوں کا جائزہ لیا جائے تو ہم پاتے ہیں کہ پہلی کہانی ''جلوہ زیبا'' میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ موت کے بعد انسان کے اعتقاد اور عمل کا اثر اس کی برزخی زندگی پر یقیناً پڑتا ہے- ظلم و جبر کے خلاف قہر الٰہی کا طوفان کس طرح امنڈتا ہے یہ جاننے کے لیے کہانی ''سوداگر کی بیٹی'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے- ''دل کا یقین'' میں یہ بات کہی گئی ہے کہ دل اگر بے یقینی کے آزار میں مبتلا نہیں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے شکست نہیں دے سکتی- ''امین جواڑی'' میں خواجہ غریب نواز کی نگاہ کرم سے دن پلٹنے کا واقعہ پیش کیا گیا ہے ''ایک برہمن دوشیزہ'' میں بادشاہ اورنگ زیب کی عوام دوستی اور انصاف پروری کا تذکرہ ہے- ''دل کی آشنائی'' ''دو شہزادے'' اور ''انعام شکست'' میں آل رسول کے ادب و احترام کا بیان ہے- کہانی ''چودھویں رات کی دوشیزہ'' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایمان و اسلام کا فرض، انسانی ہمدردی کے جذبے کو کارفرما کرتا ہے- ''کوچۂ جاناں'' کا ماحصل یہ ہے کہ عشق کی آہ و زاری اور فریاد کی سوز و تپش سے ایک بندہ گنہ گار بھی اپنے روٹھے ہوئے مولا کو راضی کر لیتا ہے- اس میں پیر و مرشد کو معزز و محترم ٹھہرایا گیا ہے- ''پاک دامن نوجوان'' میں یہ

☆At:Chand Pur Fatah,Po.Bariarpur,Distt.Vaishali(Bihar)

انکشاف کیا گیا ہے کہ نوجوان کی پاکدامنی سے اس زہرہ جمال اور کا فرادا کو بھی داخل اسلام کیا جاسکتا ہے جسے اسلام سے منحرف کر کے عیسائیت کی طرف راغب کرنے کے لیے مامور کیا گیا ہو- کہانی ''بلخ کی شہزادی'' میں عشق کی غیبی توانائی شہزادی کو عالم برزخ سے عالم ظاہر میں لے آتی ہے- ''زبیدہ خاتون'' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ دل حرص وہوس کی زنجیروں سے آزاد ہوجائے تو عالم آخرت کے سارے اعزاز کی کلید حاصل کر لیتا ہے- ''دو یتیموں کا خون'' اور ''تاراج کارواں'' واقعات کربلا کا حصہ ہیں- اس طرح لالہ زار کے واقعات سے مجموعی طور پر تحفظ ناموس الوہیت ورسالت، شہدائے کربلا سے نسبت، غوث وخواجہ سے قربت، آل رسول کی عظمت، پیرو مرشد کی عزت اور بزرگانِ دین سے عقیدت کا درس ملتا ہے- ایسی بھی کہانیاں ہیں جن میں ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا عکس نظر آتا ہے- لالہ زار کی کہانیاں علامہ ارشد القادری کی طبع زاد نہیں عبرت آموز وہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جنہیں علامہ نے ثقہ علما کے توسط سے حاصل کیا اور انہیں اپنے انداز میں پھیلا کر پیش کر دیا- انہوں نے قدیم اور تاریخی کہانیوں کو لالہ زار بنانے میں وہ کام کیا ہے جو میر امن نے باغ و بہار کے سلسلے میں کیا تھا- ان قصص وحکایات سے علامہ کی وسعت مطالعہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے- قصے کہانی لکھنے سے قبل انہوں نے ایسی چیزوں کی ورق گردانی بھی خوب کی تھی، وہ قرآن کے قصے ہوں یا مولانا روم کی مثنوی، سعدی شیرازی کی گلستاں وبوستاں کی حکایات ہوں یا پھر وہ کہانیاں جنہیں مذہب اسلام نے جائز رکھا ہے- لالہ زار کی کہانیوں کا تعلق درون ملک اور بیرون ملک کے کئی شہروں سے اور کئی زمانوں سے ہے لیکن ان سب میں مقامی اور عصری وابستگی نمایاں ہے- ان کہانیوں میں سرور وانبساط بھی ہے اور آہ وزاری بھی، طنز کی نمک پاشی بھی ہے اور جادو بیانی کی شیرینی بھی، ذکر جنگ وجدال بھی ہے اور پیام امن وامان بھی، حیرت انگیز کارنامے بھی ہیں اور غیبی واردات بھی، مگر ان سب باتوں کی نوعیت طلسم ہوش ربا کے عجائبات سے مختلف ہے- علامہ خدا کی غیبی چارہ گری کے عقیدے کو فرضی کہانی نہیں گردانتے بلکہ زندہ جاوید حقیقت مانتے تھے- اپنی واقعہ نگاری کی بعض باتوں سے متعلق اٹھائے گئے سوالات کا انہوں نے معقول جواب بھی دیا تھا- علامہ ارشد القادری بنیادی طور پر واقعہ نگار نہیں تھے، اس لیے ان کی دوسری کتابوں میں یہ رنگ نہیں ملتا، لیکن ان کی شخصیت کا عالمانہ اور قائدانہ رنگ ہر تصنیف میں ہے کیوں کہ بنیادی طور پر وہ ایک عالم دین اور قائد ملت تھے حتیٰ کہ ان کی واقعہ نگاری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں- علمی، فکری، تربیتی، تنظیمی اور تحریکی سرگرمیوں کی بدولت علامہ ارشد القادری کی ذات گرامی ایک انجمن تھی، اس لیے معاشرے کی اصلاح اور فلاح کے لیے انہوں نے قلم سے وہ کام لیا جسے عملی اقدام کہا جاسکتا ہے- علامہ کے خامۂ زرنگار سے لالہ زار کی تحریرات میں بعض ایسے جملے نکل آئے ہیں جنہیں اقوال زریں کی حیثیت حاصل ہے مثلاً:

دنیا میں کتنے دل ہیں جو کسی کی نشست وبرخاست پر عاشق ہوتے ہیں-

بادشاہوں کی طلبی خطرے سے خالی نہیں ہوتی-

مظلوموں سے ہمدردی انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے-

غلط وہاں بولا جاتا ہے جہاں غلطی چھپائی جاسکتی ہو-

ایک انسان فطرت سے کب تک جنگ کرتا رہے گا-

ہمت ہارنا راہ الفت کے مسافر کا شیوہ نہیں-

علامہ ارشد القادری کی ڈھائی درجن سے زیادہ تصانیف ان کے رئیس القلم ہونے کا بین ثبوت ہیں- انہیں قلم کی وہ بادشاہت حاصل تھی کہ انہوں نے تحریر کے ہر میدان میں اپنی برتری تسلیم کرائی- ان کی اور تحریروں کی طرح قصے کہانیاں پڑھتے ہوئے بھی قاری محو ہو کر رہ جاتا ہے- لالہ زار کی کہانیاں، داستان امیر حمزہ کی طرح طویل نہیں اور نہ آج کے افسانے اور افسانچے کی طرح مختصر- قاری جب انہیں پڑھتا ہے تو پڑھتا چلا جاتا ہے- ہر مقام پر یہ تجسس باقی رہتا ہے کہ آگے کیا ہوتا ہے- سچ تو یہ ہے کہ لالہ زار کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے قاری علامہ کی دوسری کتابوں کی تحریروں کو بھی بھول جاتا ہے- مولانا عبدالرحمٰن فیضی نے لالہ زار کو کہانیوں کے پیرائے میں عشق وایمان کے جذبات کو جگا دینے والی ایسی کتاب بتایا ہے جس کو پڑھنے کے بعد ہر مومن کا قلب جھوم جاتا ہے، بار بار پڑھنے کے بعد بھی طبیعت نہیں اکتاتی، الفاظ کی سجاوٹ اور خوب صورت جملے دیکھنے کے بعد علامہ صاحب کی ادیبانہ صلاحیتوں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے- پروفیسر فاروق احمد صدیقی اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''قدرت نے علامہ کو عمدہ ادبی نثر نگاری کی وہ صلاحیت بخشی تھی کہ وہ چاہتے تو اردو ادب کو کئی افسانوی مجموعے اور ضخیم ناولوں کے مجلدات دے سکتے تھے مگر انہوں نے دنیا کمانے کے بجائے آخرت کو ترجیح دی اور ناموس رسالت کے تحفظ کے لیے اپنی زندگی اور قلم کو وقف کر دیا-''

ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی نے علامہ ارشد القادری کی نثر کو ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی اور ادب برائے بندگی قرار دیا ہے- وہ لکھتے ہیں: ''علامہ افسانے نہیں گڑھتے بلکہ حقیقی واقعات کو اپنے قلم کی سحر کاری سے افسانوی زبان وبیان میں لاتے ہیں کہ حقیقت کا کوئی بھی گوشہ کسی طرح کی آلودگی کے بغیر اپنا وہ روپ دکھاتا ہے کہ نگاہیں جلوؤں کے ہجوم میں گم ہو کر سچائی کے ایک ایک تاباں وتوانا زاویہ کی زیارت سے محظوظ ہوتی ہیں اور ایمان وعقائد کا جہان نور آباد ہو جاتا ہے-'' ڈاکٹر عزیزی مزید لکھتے ہیں: ''علامہ کی نثر کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں فکری قوت اور منطقی توانائی کے ساتھ لطف اور اثر بہت شدید ہوتا ہے- وہ فکر کے خانوں میں تخیل کا رنگ بھر کر نثر کو باغ کامرانی کا سدابہار پھول بنا دیتے ہیں- علامہ نے جس والہانہ انداز میں جذبات کا اظہار کیا ہے اور منظر نگاری میں جو جان ڈالی ہے محاکات اور پیکر تراشی کے جو حسین جلوے پیش فرمائے ہیں وہ شاعری کا ایک مرقع ہے-'' علامہ ارشد القادری نے اپنی اکثر کہانیوں میں شعر کا استعمال کر کے اس کے اختتام کو شاعرانہ بنا دیا ہے- ان کے ذریعے کوٹ کیے گئے اشعار اس طرح ہیں:

دل ہی ڈبوئے دل ہی ترائے
دل سا دوست نہ دل سا دشمن

تیرے میکدے میں کمی ہے کیا جو کمی ہے ذوق طلب میں ہے
جو ہوں پینے والے تو آج بھی وہی بادہ ہے وہی جام ہے

ہے ان کے عطر بوئے گریباں سے مست گل
گل سے چمن چمن سے صبا اور صبا سے ہم

شعاع مہر خود مہتاب ہے جذب محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی

پروانے کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

آمدہ بودیم از دریا بہ موج
باز از موجے بدریا می رویم

علامہ ارشد القادری ایک بلند خیال، خوش فکر اور قادر الکلام شاعر بھی تھے، اس لیے ان کی نثر میں شعریت کا رچاؤ ملتا ہے- فارسی اضافت ہو یا ہندی تراکیب وہ بڑی ہنر مندی سے ان کا استعمال کرتے ہیں- انہوں نے واقعہ نگاری کی نثر میں بھی مرصع سازی کا نمونہ پیش کیا ہے- چند فقرے ملاحظہ فرمائیں:

''کوثر کے ساحل پر جاں نثاروں کی تعداد میں ایک عدد کا اور اضافہ ہوا''- ''اس نے اپنے شعور کی بکھری ہوئی توانائیوں کو سمیٹ کر بڑی مشکل سے جواب دیا- ایک ایسی مری ہوئی حسرت جاگ اٹھی ہے جس کے لیے سارے جہاں کی خاک چھان کر ہم مایوسی کے اتھاہ ساگر میں ڈوب گئے تھے- ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شاہی محل کی دیواروں پر سے چاندنی ڈھلنے لگی، بہار کا موسم دبے پاؤں چمن سے رخصت ہونے لگا-''

لالہ زار کی کہانیوں میں ایسا کوئی کردار نہیں جو سارے قصوں میں مشترک ہو، ہر کہانی کا کردار جداگانہ ہے ہاں لالہ نام کی تکرار کئی کہانیوں میں ہے- ''دل کا یقین'' میں لالہ کے دلہن بنائے جانے کا منظر ملاحظہ فرمائیں:

''ارمانوں کے ہجوم میں آج لالہ دلہن بنائی جا رہی تھی، ایک مہینے تک ہلدی ابٹن نے اسے آب زر کی طرح چمکا دیا تھا، فنکار مشاطاؤں نے جب اسے سنوار کر حجلۂ عروسی میں پہنچایا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں، شفاف جھیل کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں میں کاجل کی لکیر، کالی گھٹاؤں کے افق پر سفید افشاں کی جگمگاہٹ اور بیچ میں سیندور کی لالی موسم برسات کے ڈوبتے ہوئے سورج کی تصویر اتار لائی تھی، ہزاروں اہتمام کے باوجود گھونگھٹ کا چلمن اس ماہ وش کی چاندنی پر حائل نہیں ہو سکتا تھا- فرط حیا سے جھکی ہوئی پلکوں کا عالم سوئی ہوئی قیامت کا صحیح نمونہ تھا اور شادی کا سرخ جوڑا زیب تن کر لینے کے بعد تو ایسا لگتا تھا کہ کسی لالہ زار کی پری اتر آئی ہے-''[۲۲]

اپنی ان دل کش، دیدہ زیب اور توجہ طلب تحریروں کی بدولت رئیس القلم نے نہ صرف کہانی ''دل کا یقین'' کو بلکہ واقعات کی پوری کتاب کو لالہ زار بنا دیا ہے- قلم کے اس دھنی نے ''سوداگر کی بیٹی'' کا حسن جن الفاظ میں بیان کیا ہے ''سونار کی بیٹی'' کے لیے ان الفاظ کا استعمال نہ کر کے دوسرے جملوں سے کام لیا ہے اور پھر حکیم کی لڑکی یا عیسائی کی بیٹی کے لیے کچھ اور فقرے، جس کی تصویر کشی میں یہ فرق اس بات کا غماز ہے کہ رئیس القلم کو اس فن میں ید طولیٰ حاصل تھا، یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ واقعہ دو شہزادے میں وہ فاطمی شہزادے کے جمال کی عکاسی کس طرح کرتے ہیں:

بقیہ صفحہ 44 پر ملاحظہ کریں

ازہار احمد امجدی☆

محدثین کی نظر میں حدیث ضعیف

ایک تجزیاتی مطالعہ

جام نور اکتوبر و نومبر ۲۰۱۰ء میں جام نور کے مستقل قلم کار اور ممتاز محقق و ناقد مولانا اسید الحق قادری بدایونی کا مضمون ''تقریروں میں موضوع روایات: ایک لمحہ فکریہ'' شائع ہوا تھا، جس کے بعد بحث و مباحثہ اور نقد و نظر کا ایک سلسلہ چل پڑا، ان میں سے بعض تائیدی اور بعض تنقیدی تحریریں ہم جام نور کی گزشتہ اشاعتوں میں شائع بھی کر چکے ہیں۔ زیر نظر مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو مولانا ازہار احمد امجدی (متعلم جامعۃ الازہر مصر) کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ مولانا ابھی زیر تعلیم ہیں، پھر بھی انہوں نے ایسے حساس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت کی ہے جو یقیناً قابل تعریف ہے۔ مضمون پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا محنت سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں گو کہ ان کے قلم میں ابھی پختگی نہیں آئی ہے، جگہ جگہ ثقیل اور نامانوس عربی الفاظ کا استعمال ان کے ''ازہری'' ہونے کا پتہ دے رہا ہے، لیکن ہم ان کے روشن مستقبل کے لیے دعا گو ہیں۔ زیر نظر مضمون دراصل مولانا اسید الحق صاحب کے ایک جملے کی تشریح و تفسیر پر مبنی ہے، مولانا نے جو بات چند سطروں میں کہہ دی تھی مولانا ازہار احمد نے اس کو دلائل کا جامہ پہنا کر اور مدلل کر دیا، مولانا اسید الحق صاحب نے لکھا تھا ''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قاعدہ (فضائل میں ضعیف حدیث بھی مقبول ہوتی ہے) اپنی جگہ درست ہے، اس کے ثبوت میں بڑے بڑے ائمہ حدیث کے حوالے دیے جا سکتے ہیں، لیکن اس قاعدے کے اطلاق کا بھی ایک دائرہ ہے اور اس کے استعمال کے کچھ شرائط ہیں''۔ (جام نور اکتوبر ۲۰۱۰ء ص:۱۲)

آگے لکھتے ہیں ''ہم ان متشددین کے حامی نہیں جو معمولی سی معمولی علت کی بنیاد پر حدیث کو موضوع قرار دے دیتے ہیں اور ضعیف حدیث خواہ اس میں کتنا ہی خفیف درجے کا ضعف ہو اس کو رد کر دیتے ہیں، متقدمین میں حافظ ابن جوزی اور متاخرین میں علامہ ناصر الدین البانی اور ان کے ہم مزاج حضرات کو اس کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے''۔ (جام نور اکتوبر ۲۰۱۰ء ص:۱۲) ازہار صاحب کے اس مضمون سے مولانا اسید الحق صاحب کی مذکورہ عبارتوں کی تائید ہی ہوتی ہے، مولانا اسید الحق کی دو عبارتوں سے ازہار صاحب کو یہ گمان ہوا کہ مولانا اسید الحق مطلقاً ضعیف حدیثوں کو قابل قبول نہیں سمجھتے حالانکہ اسید الحق صاحب کا یہ مقصد نہیں تھا، آپ مولانا کے مضمون کو دوبارہ امعان نظر سے پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مولانا کا مقصد صرف یہ ہے کہ جن معاملات میں ہمارے پاس صحیح احادیث موجود ہیں وہاں ہم ضعیف اور کمزور احادیث بیان کر کے اپنے مسلکی حریف کو یہ کہنے کا موقع کیوں دیں کہ ان حضرات کے سارے عقائد اور معاملات ضعیف احادیث پر منحصر ہیں۔ مولانا اسید الحق صاحب کی یہ بات ہمیں دعوت فکر دیتی ہے کہ ہمارے مقررین ہوں یا مصنفین ان کی کوشش ہونی چاہیے کہ اپنے عقائد و اعمال کے ثبوت میں مقام اول میں صحیح احادیث کو جگہ دیں تاکہ کسی متشدد کو ضعیف حدیث کی دہائی دے کر عوام کو بہکانے کا موقع نہ ملے۔ بہر حال ضعیف احادیث کی تفہیم کے سلسلے میں یہ ایک سنجیدہ کوشش ہے، جو قارئین جام نور کے ذوق مطالعہ کی نذر کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

ہر دین و مذہب کا کوئی نا کوئی مصدر ہوا کرتا ہے، جس کا پیرو کار اپنے تمام تر امور و معاملات میں اس مصدر کی اتباع کرتا ہے، اسی طرح دین اسلام کے بھی مصادر ہیں، جس کا متبع انہی مصادر کی طرف اپنے روزمرہ کے مسائل کے حل کے لیے رجوع کرتا ہے، اور یہ مصادر چار ہیں: قرآن کریم، احادیث نبویہ، اجماع اور قیاس۔ مصدر ثانی احادیث نبویہ بھی قرآن کریم کی طرح بڑی اہمیت کی حامل ہے، ان احادیث نبویہ کے بغیر قرآن کریم کا پورے طور سے سمجھنا بہت مشکل ہے، اسی وجہ سے اللہ جل شانہ نے جس طرح مصدر اول قرآن کریم کو تغییر و تحریف سے اپنے حفظ و امان میں رکھا، مصدر ثانی احادیث نبویہ کو بھی دسیسہ کاریوں سے محفوظ و مامون فرمایا، اور اس کی حفاظت کے لیے ایسے ایسے علمائے حدیث، حفاظ اور نقاد پیدا کیے، جنہوں نے احادیث مبارکہ کو وضاعین و کذابین کے ناپاک عزائم سے مامون رکھنے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی، ہر غالی و رخیص ان کی حفاظت کے لیے خرچ کیے، ان کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے تعلق سے اصول و قوانین وضع

☆Student:Jamia Azhar,Cairo,Egypt.email: azharmisbahi2005@yahoo.co.in

کیے، اور پھر انہی اصول وقوانین کے پیش نظر احادیث کی تین قسمیں کیں: حدیث صحیح، حدیث حسن، حدیث ضعیف- پہلی دو قسمیں: حدیث صحیح وحدیث حسن متفقہ طور پر مقبول قرار پائیں، رہی آخری قسم حدیث ضعیف تو وہ علماے حدیث کے نزدیک مختلف فیہ ہیں- جمہور علما و محدثین اور فقہاے کرام اس بات کے قائل ہوئے کہ عقائد اور احکام وغیرہ میں احادیث ضعیفہ مقبول نہ ہوں گی، البتہ فضائل اعمال، مغازی، سیر، اور ترغیب وترہیب کے باب میں ان احادیث کو قبول کیا جائے گا، اسی کے پیش نظر بڑے بڑے نقاد وحفاظ نے ان ابواب میں ضعفا سے بھی حدیثیں قبول کیں، اور یہ آج کی پیداوار نہیں، اس بات کو تو خیر القرون کے بڑے بڑے علماے حدیث نے بھی تسلیم کیا ہے، چنانچہ دوسری صدی کے امام وحافظ سفیان بن سعید ثوری (ت ۱۶۱) عبد اللہ بن المبارک (ت ۱۸۱) سفیان ابن عیینہ (ت ۱۹۸) اور دوسری، تیسری صدی کے امیر المؤمنین فی الحدیث یحیٰ بن معین (ت ۲۳۳) رحمہم اللہ اسی فکر کے علمبردار تھے، اور یہی فکر صحیح بھی ہے- مگر 'ناصر الدین البانی' اور اس جیسے بعض متاخرین کو یہ صحیح فکر راس نہ آئی، اور احادیث ضعیفہ کو اپنے تشدد وتعنت کا شکار بنایا، اور بہت ساری ضعیف حدیثوں کو موضوع قرار دے دیا، جو یقیناً خطا اور بے جا تعنت کے سوا کچھ نہیں- دور حاضر میں بھی بعض علما کو اس تشدد کی ہوا لگ گئی اور وہ ضعیف ومنکر پر فضائل کے باب میں عمل کرنے سے منع کرنے لگے، جن کی فکر 'البانی' کے شذوذ وتشدد سے خفیف ضرور ہے مگر اس تعنت کے لوا کا حامل ضرور ہے- اسی لیے میں یہاں پر احادیث ضعاف پر فضائل کے باب میں عمل کرنے کے تعلق سے محدثین کے مذاہب، اور اس کی ایک خاص قسم 'حدیث موضوع' کو شرح وبسط اور نقد کے ساتھ بیان کرنے کے بعد خلاصۂ کلام ذکر کروں گا، تاکہ شواہد وبراہین کی بنیاد پر تردد وتذبذب کے دلدل میں پھنسے حضرات یقین واطمینان کے گہوارے میں پناہ حاصل کر سکیں، اور ایسے امر سے دست برداری کی کوشش نہ کریں جس پر عمل کرنا محدثین کرام وفقہاے عظام کا اجماعی مسئلہ ہے، یا کم از کم جمہور اس پر عمل کرنے کے قائل ہیں، اور اہل ہوش وخرد، اصحاب حل وعقد اور دیگر حضرات انہی دلائل کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر سکیں کہ احادیث ضعاف اور کثرت خطا وغیرہ کی وجہ سے شدید ضعیف حدیثوں پر عمل کرنا غلط ہے یا صحیح، اور یہ طے کر سکیں کہ حدیث موضوع کب ہوگی- پہلے احادیث ضعاف قبول کرنے اور نہ کرنے کے تعلق سے مذاہب کی تفصیل پیش خدمت ہے، پھر ان شاء اللہ اس کی ایک خاص قسم 'حدیث موضوع' کے بارے میں محدثین کرام کی آرا ذکر کروں گا- أرجو الله أن يهديني سواء الطريق بجاه سيدنا محمد ﷺ-

احادیث ضعاف پر عمل کرنے کے تعلق سے چار مذاہب ہیں:

پہلا مذہب: جمہور علما ومحدثین کے نزدیک احادیث ضعاف فضائل کے باب میں معتبر ہیں، بلکہ امام نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع کا قول نقل کیا ہے، اس مذہب کی دو شاخیں ہیں: فرع اول: احادیث ضعیفہ جو موضوع کے قبیل سے نہیں وہ فضائل اعمال میں بغیر کسی قید کے مطلقا مقبول ہونگی، اکثر علما اسی کے قائل ہیں، امام نواوی رحمہ اللہ اور دیگر بہت سارے محدثینؒ نے حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے 'عدم ضعف شدید' کی شرط سے مقید نہیں کیا ہے-

فرع ثانی: موضوع کے علاوہ احادیث ضعیفہ پر مطلقا عمل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کے لیے چند شرطوں کا تحقق ضروری ہے، اس کے قائل حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ہیں- شرط اول: راوی میں ضعف شدید نہ ہو، لہذا کذاب یا جس پر جھوٹ کی تہمت لگی ہو یا وہ شخص جو غلطی زیادہ کرتا ہو، اگر کسی حدیث کو تنہا روایت کرے تو فضائل کے باب میں بھی اس کی حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا، علامہ صلاح الدین علائی رحمہ اللہ نے اس شرط پر اتفاق کا قول کیا ہے، شرط ثانی: حدیث ضعیف کسی معمول بہ اصل کے تحت داخل ہوتی ہو، شرط ثالث: احتیاط کے طور پر اس حدیث ضعیف پر عمل کرے اور اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھے-(۱)

دوسرا مذہب: بعض دیگر علما کی رائے یہ ہے کہ فضائل اعمال و ترغیب وترہیب اور احکام وغیرہ میں احادیث ضعاف پر مطلقا عمل نہیں کیا جائے گا، اس رائے کے ماننے والے امام ابوبکر بن العربی وابن حزم ظاہری رحمہما اللہ ہیں-

تیسرا مذہب: بعض علما اس بات کے قائل ہیں کہ اگر احادیث ضعیفہ کا ورود محل احتیاط میں ہو تو اس پر عمل کرنا بہتر ہے-(۲)

چوتھا مذہب: احادیث ضعاف احکام میں قیاس پر مقدم ہوں گی، اس کے قائل امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں، یعنی اگر کسی مسئلہ میں صحیح حدیث نہ ہو اور اس کے جواز اور عدم جواز میں احادیث ضعاف اور

قیاس کے درمیان اختلاف ہو تو احادیث ضعاف پر عمل کریں گے اور قیاس کو چھوڑ دیں گے، ان کے علاوہ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک بن انس، اور امام محمد بن ادریس شافعی رحمہم اللہ کا بھی بعض احادیث ضعیفہ پر عمل رہا ہے۔(۳) یہاں پر پہلے دو مذاہب پر قدرے تفصیلی گفتگو کروں گا اور باقی کو آیندہ کے لیے مؤخر کیے دیتا ہوں۔

پہلا مذہب: جس کی دو شاخیں ہیں، فرع اول: کے ماننے والے علما اور ان کے اقوال مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) امام نووی رحمہ اللہ 'الاذکار' میں فرماتے ہیں: علما و محدثین اور فقہائے کرام اس بات کے قائل ہیں کہ حدیث ضعیف اگر موضوع نہ ہو تو فضائل اعمال اور ترغیب و ترہیب کے باب میں اس پر عمل کرنا مستحب ہے۔(۴)

(۲) امام سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی متعدد تصانیف میں فضائل کے باب میں احادیث ضعاف معتبر ہونے کے بارے میں 'عدم ضعف شدید' کی قید کے بغیر محدثین اور دیگر علما کا اجماع نقل کیا ہے۔(۵)

(۳) صاحب الحلیہ شرح المنیہ فرماتے ہیں: حدیث ضعیف پر فضائل اعمال میں عمل کرنا درست ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اس کا انحطاط موضوع کی حد تک نہ ہو، اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔(۶)

(۴) خاتم الحفاظ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محدثین وغیرہ کے نزدیک ضعیف سندوں میں تساہلی برتنا، موضوع کے علاوہ ضعیف حدیثوں کی روایت کرنا، اور فضائل اعمال وغیرہ میں ان پر عمل کرنا جائز و درست ہے، البتہ اس طرح کی حدیثیں صفات باری تعالیٰ اور حرام و حلال کے باب میں معتبر نہ ہوں گی۔(۷)

(۵) امام زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محدثین کی عادت ہے کہ وہ احکام و عقائد کے علاوہ فضائل اعمال وغیرہ میں احادیث ضعاف میں تساہلی سے کام لیتے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ وہ حدیثیں موضوع نہ ہوں۔(۸)

(۶) امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ فرمانا کہ "اگر کوئی ایسا راوی جس پر جھوٹ کی تہمت لگائی گئی ہو، یا غفلت اور کثرت خطا کی وجہ سے حدیث میں ضعف ہو، اور پھر وہ کسی حدیث کی روایت کرنے میں منفرد ہو، تو اس کی حدیث قابل احتجاج نہیں"۔ ان کی مراد اس قول سے یہ ہے کہ ایسے اوصاف سے موصوف رجال کی حدیثیں احکام شرعیہ میں معتبر نہیں، البتہ اگر اس قسم کے راوی ترغیب و ترہیب میں روایت حدیث کریں تو معتبر ہوگی چنانچہ بہت سارے ائمہ اعلام نے اس کی رخصت دی ہے۔

(۷) امام سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: حرام و حلال میں احادیث انہی لوگوں سے اخذ کرو جو اس فن کے امام ہیں، جو زیادتی اور کمی کو خوب جانتے ہیں، ہاں اگر احادیث مسائل حرام و حلال سے ہٹ کر فضائل اعمال وغیرہ سے ہوں تو مشائخ سے روایت کرنے اور ان سے احادیث لینے میں کوئی حرج نہیں۔

(۸) امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: 'عبدۃ' نے ہم سے روایت کی وہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ کی بات ہے، امام عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ نے کسی شخص سے حدیث روایت کی، تو آپ سے کہا گیا کہ یہ شخص تو ضعیف ہے تو آپ نے فرمایا اس طرح کی روایتیں اس سے لی جا سکتی ہیں۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے 'عبدۃ' سے پوچھا وہ کس طرح کی روایتیں تھیں تو انھوں نے فرمایا: ادب، موعظہ اور زہد کے بارے میں تھیں۔(۹)

(۹) امام ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں موضوع کے علاوہ فضائل اعمال میں وارد حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا۔(۱۰)

(۱۰) حافظ المغرب امام ابن عبد البر مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تمام محدثین فضائل میں اس حد تک تساہلی کرتے ہیں کہ اس باب میں ہر ایک سے حدیثیں لے لیتے ہیں، ہاں اگر حدیثیں احکام میں ہوتی ہیں تو اس میں تشدد سے پیش آتے ہیں۔(۱۱)

(۱۱) امام علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علما کا اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث پر جن کا ورود فضائل اعمال میں ہوا ہے عمل کیا جائے گا۔(۱۲)

(۱۲) امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب ہم احکام میں حدیثیں روایت کرتے ہیں تو اس میں شدت، اور فضائل وغیرہ میں تساہلی سے کام لیتے ہیں۔(۱۳)

(۱۳) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر فسق وغیرہ کی وجہ سے راوی متروک ہو اور ساتھ ہی وہ کذب سے بری ہو تو اس کی حدیث احکام میں معتبر نہیں ہوگی، ہاں فضائل کے باب

میں راجح یہی ہے کہ اس کی حدیث مطلقا مقبول ہوگی اگر چہ وہ اس حدیث کے روایت کرنے میں منفرد ہو، اور بعض کے نزدیک تعدد طرق کے بعد قابل اعتبار ہوگی۔(۱۴)

ان علمائے حدیث کے علاوہ دیگر علما و محدثین کے اسما جو فضائل اعمال وغیرہ میں موضوع کے علاوہ حدیث ضعیف کو بغیر کسی شرط کے مطلقا معتبر مانتے ہیں، یا یہ کہ ان کے اقوال میں 'عدم ضعف شدید' کی شرط مذکور نہیں، اور وہ یہ ہیں: امام ابن مہدی، ابن معین، سفیان ابن عیینہ، ابوداؤد صاحب السنن، عبدالغنی نابلسی، شہاب الدین خفاجی مصری، ابوطالب مکی، ابن تیمیہ، زین الدین عراقی، بدرالدین زرکشی، ابن حجر مکی، ابوزکریا غبری رحمہم اللہ وغیرہم۔ میں نے طوالت کے خوف سے یہاں صرف نام شمار کرنے پر اکتفا کیا ہے، ان کے اقوال کی مزید تفصیل کے خواہاں حضرات ان کتابوں کی طرف رجوع کرسکتے ہیں: شرح علل الترمذی، تدریب الراوی، الحدیقة الندية شرح الطريقة المحمدية، نسيم الرياض، شرح المشكلة لابن حجر المكي، الخلاصة فی احكام الحديث الضعيف، فتح المغيث للعراقی، فتح المغيث للسخاوی، قوت القلوب، الهاد الكاف وغیرہ۔

پہلے مذہب کی فرع ثانی: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ترغیب وترہیب میں واردشدہ احادیث ضعاف پر مطلقا عمل کرنا جائز نہیں، ان پر عمل کرنے کے لیے تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ شرط اول: راوی میں ضعف شدید نہ ہو، لہذا کذاب یا جس پر جھوٹ کی تہمت لگی ہو، یا وہ شخص جو غلطی زیادہ کرتا ہو، اگر کسی حدیث کو تنہا روایت کرے تو فضائل کے باب میں بھی اس کی حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا، علامہ صلاح الدین علائی رحمہ اللہ نے اس شرط پر اتفاق کا قول کیا ہے۔
اس شرط کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیلی کلام کیا جائے۔

یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ علامہ علائی رحمہ اللہ کا صرف قول ملتا ہے جنہوں نے حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے 'عدم ضعف شدید' کی شرط لگا کر اس پر اتفاق کا قول کیا ہے، انہیں کے قول کو خاتم الحفاظ امام سیوطی رحمہ اللہ نے "تدریب الراوی" میں، اور امام سخاوی رحمہ اللہ نے "القول البدیع" میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ مجھے ان کے علاوہ کسی اور کا قول اس شرط کے ذکر کے ساتھ نہیں ملا، ہاں اس کے برخلاف امام نووی رحمہ اللہ جو علامہ علائی رحمہ اللہ سے مقدم ہیں، انہوں نے بغیر 'عدم ضعف شدید' کی قید کے حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے بارے میں اجماع کا قول کیا ہے، نیز امام نواوی رحمہ اللہ نے اپنی کسی کتاب میں اس شرط کا ذکر نہیں کیا، بس اسی پر اکتفا کیا کہ حدیث ضعیف فضائل میں ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا، چنانچہ خاتم الحفاظ امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابن الصلاح رحمہ اللہ نے "مقدمہ" میں اور امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی ساری کتابوں میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے صرف ایک شرط ذکر کی ہے، اور وہ یہ کہ فضائل کے باب میں ہو بس۔(۱۵) حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے اگر 'عدم ضعف شدید' کی شرط ہوتی تو ابن الصلاح اور امام نووی رحمہما اللہ اور دیگر محدثین وناقدین اس شرط کے ذکر کرنے کا التزام ضرور کرتے، کیونکہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ محدثین کا کسی شرط پر اتفاق ہو اور وہ اس کے موقع ومحل پر بیان کرنے سے گریز کریں۔

لہذا کیا علامہ علائی رحمہ اللہ کے اس اتفاق کے قول پر اتفاق کیا جا سکتا ہے؟ اگر گہرائی، گیرائی اور دقت نظری سے دیکھا جائے تو حقیقت یہی کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کے قول سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی یہ قبول کیا جاسکتا ہے کہ فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شدید ضعیف نہ ہو، اس کی چند وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: مذہب اول کی فرع اول کے بڑے بڑے محدثین و فقہائے کرام وعلمائے عظام کے اقوال وآرا اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ احادیث ضعاف فضائل کے باب میں اگر موضوع نہ ہوں تو بغیر کسی شرط وقید کے معتبر ہیں۔

دوسری وجہ: اسی طریقہ کار پر محدثین وغیرہ کا اجماع بھی ہے جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے اسی کی طرف بغیر 'عدم ضعف شدید' کی قید کے اپنی تصنیفات میں اشارہ فرمایا ہے۔

تیسری وجہ: علامہ علائی رحمہ اللہ نے اگر چہ اس شرط پر اتفاق کا قول نقل کیا ہے، مگر ان کا عمل خود اس شرط کے خلاف ہے، چنانچہ علامہ علائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: راوی 'الحکم بن سعید سعدی' کو امام ابوالفتح محمد بن حسین ازدی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے، اور امام بخاری فرماتے ہیں: وہ 'منکر الحدیث' ہیں، پھر بھی اس راوی کی روایت کو 'زکریا بن منظور' کی روایت کے لیے متابع مانا جاسکتا ہے۔(۱۶)

دور جدید کے محققین توجہ فرمائیں، امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: 'الحکم بن سعید سعدی' منکر الحدیث ہیں، جس کا معنی عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ جس کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ منکر الحدیث فرمادیں، اس سے حدیث روایت کرنا جائز نہیں، جیسا کہ ان کی طرف یہ قول منسوب بھی ہے، چہ جائے کہ اس کو کسی راوی کی حدیث کے لیے متابع مانا جائے، مگر امام المحدثین کی اس جرح کے باوجود بھی، حافظ علائی رحمہ اللہ نے 'الحکم بن سعید سعدی' کی روایت کو 'زکریا بن منظور' کی روایت کے لیے متابع مانا۔

چوتھی وجہ: جب ہم امام ابن حجر رحمہ اللہ کے نقد وکلام کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ آپ کا عمل اپنی ذکر کردہ شرط کے خلاف ہے، چنانچہ بعض احادیث کے بارے میں جس کا راوی غلط فاحش کا شکار ہوتا ہے، بلکہ موضوعات روایت کرنے سے متہم ہوتا ہے، اس کے بارے میں آپ فرماتے ہیں۔ فضائل اعمال اور ترغیب وترہیب کے باب میں ان کی حدیث قابل عمل اور معتبر ہے محض دعوی نہ رہے اس لیے ذیل میں اس کی مثال پیش خدمت ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف 'مسند' میں فضیلت عسقلان کے بارے میں ایک حدیث روایت کی ہے، جس کی سند میں ایک راوی 'ابوعقال ہلال بن زید' ہیں ان کی ایک حدیث کو امام عبدالرحمٰن بن الجوزی رحمہ اللہ نے اپنی موضوعات میں شمار کیا ہے، کیونکہ مذکور راوی کے بارے میں ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: 'ابوعقال ہلال بن زید' حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موضوع حدیثیں روایت کرتے ہیں۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ تعقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ یہ حدیث فضائل اعمال اور رباط پر تحریض کے لیے ہے، اور اس حدیث میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو شرعاً یا عقلاً محال ہو، لہذا اس حدیث کو صرف اس وجہ سے باطل کہنا کہ اس کے راوی 'ابوعقال' ہیں درست نہیں، خاص طور سے اس صورت میں جبکہ معروف ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فضائل میں تساہل کے قائل ہیں۔ (۱۷)

اسی 'ابوعقال ہلال بن زید' کے بارے میں امام بن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا 'متروک' ہیں، اور ان کے نزدیک متروک وہ ہے جو متہم بالکذب ہو (۱۸)

قارئین کرام غور فرمائیں، ان تمام جرح وقدح کے بعد بھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا یہ حدیث فضائل اعمال میں ہے اس لیے اس پر بطلان کا حکم لگانا درست نہیں، اس سے صاف واضح ہے کہ آپ 'متہم بالوضع' کی روایت کو فضائل میں معتبر مانتے ہیں چہ جائے کہ وہ غلط فاحش میں مبتلا ہو۔

پانچویں وجہ: جن بعض محدثین کرام نے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ سے یہ عبارت نقل کی ہے ان کا عمل بھی خود اس شرط کے خلاف ہے، چنانچہ جب ابن الجوزی رحمہ اللہ نے حدیث انس رضی اللہ عنہ 'ستفتح علیکم بالآفاق'۔ الحدیث، فضل قذوین کو اپنی کتاب 'الموضوعات' میں ذکر کی اور اس پر نقد فرمایا کہ اس کی سند میں ایک راوی 'داود بن المحبر' وضاع ہیں، اور دوسرے 'الربیع بن صبیح' ضعیف، اور تیسرے 'یزید بن ابان' متروک ہیں۔

ان کے اس کلام پر خاتم الحفاظ امام سیوطی رحمہ اللہ جنہوں نے حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے 'عدم ضعف شدید' ہونے کی شرط کو اپنی کتاب ''تدریب الراوی'' میں ذکر کیا ہے، تعقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنی ''سنن'' میں ذکر کیا ہے، اور امام مزی رحمہ اللہ ''تہذیب الکمال'' میں فرماتے ہیں۔ یہ حدیث منکر ہے، 'داؤد' کے علاوہ کسی اور کی روایت سے معروف نہیں اور منکر ضعیف کی قسم سے ہے جو فضائل میں محتمل ہوتی ہے۔ (۱۹) یہ مثال ان محققین کے لیے ہے جو منکر الحدیث کو انتہائی شدید ضعیف مانتے ہیں، ورنہ میرے نزدیک اس کے قائل کی طرف نظر کرتے ہوئے منکر الحدیث کے متعدد مراتب ہیں، انشاء اللہ اس کا مفصل بیان، حدیث ''اطلبوا العلم ولو بالصین'' کی تحقیق میں آئندہ کسی شمارے میں آئے گا۔

امام سخاوی رحمہ اللہ نے بھی حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے 'عدم ضعف شدید' ہونے کی شرط کو اپنی کتاب 'القول البدیع' میں ذکر کیا ہے، اور اس پر امام علائی رحمہ اللہ کے اتفاق کا قول بھی نقل فرمایا ہے۔ اس کتاب کے محقق 'محمد عوامہ' اس پر تعلیق لگاتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس اتفاق کے دعوی پر نظر طویل ہے، اللہ جل شانہ سے امید کرتا ہوں کہ جلد ہی کسی مناسب مقام پر اس پر تفصیلی کلام کرنے کا موقع عنایت فرمائے، اور پھر رہنمائی فرمائی کہ خود مصنف سخاوی رحمہ اللہ کا عمل اس شرط کے خلاف ہے، چنانچہ امام سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حدیث دعاء الحاجۃ بہت ضعیف ہے، فضائل اعمال میں لکھی جائے گی''۔ (۲۰)

یہ پانچوں وجہیں بہترین شاہد عدل ہیں، میرے اس قول پر کہ ”علامہ علائی رحمہ اللہ کے قول سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہی یہ قبول کیا جا سکتا ہے کہ فضائل کے باب میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شدید ضعیف نہ ہو“۔ نیز کم از کم یہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر راوی کی کثرت خطا، غفلت یا فسق کی وجہ سے حدیث شدید ضعیف ہو تو بھی وہ حدیث فضائل کے باب میں مقبول ہوگی۔ اور رہی یہ بات کہ اگر راوی کذاب یا متہم بالکذب وغیرہ ہو تو حدیث کا کیا حکم ہوگا تو اس کا حکم بحث کے اخیر میں آئے گا۔

دوسرا مذہب: دو چند علما و محدثین اس بات کے قائل ہیں کہ ترغیب و ترہیب اور احکام وغیرہ کسی بھی باب میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا جائز نہیں، اس رائے کے قائلین کے اسمایہ ہیں: امام یحی بن معین، ابوبکر ابن العربی، ابن حزم ظاہری اور مسلم بن الحجاج رحمہم اللہ۔ (۲۱)

ابن سید الناس رحمہ اللہ نے ’عیون الاثر‘ میں امام یحی بن معین رحمہ اللہ کی طرف اس قول کو منسوب کیا ہے۔ (۲۲) گویا کہ ان کے حدیث ضعیف کے تعلق سے دو مختلف اقوال ہیں، ایک یہ کہ ضعیف حدیث فضائل میں معتبر ہے، جیسا کہ مذہب اول کی فرع اول میں گزرا، اور دوسرا یہ کہ حدیث ضعیف فضائل و احکام وغیرہ کسی میں بھی معتبر نہ ہو گی، مگر پہلا قول ہی راجح ہے، کیونکہ وہی قول جمہور محدثین و فقہا کی آرا کے موافق ہے۔

ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر حدیث کی سند میں کوئی ایسا راوی ہو جس پر جرح کذب یا غفلت یا مجہول الحال ہونے کی وجہ سے کی گئی ہو تو اس کی روایت لینا ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ (۲۳)

امام عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ابن العربی رحمہ اللہ نے حدیث ضعیف پر عمل کرنے سے مطلقا منع فرمایا ہے۔ (۲۴) حالانکہ صحیح یہ ہے کہ آپ بھی حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے قائل تھے۔ (حاشیۃ القول البدیع للسخاوی ص ۴۹۶)

امام ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ’صحیح‘ کے مقدمہ میں جو منہج اختیار کیا ہے، اس سے یہی ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ترغیب و ترہیب کی حدیثیں انہی سے لے سکتے ہیں جن سے احکام کی حدیثیں لی جاتی ہیں۔ (۲۵) یعنی جس طرح احکام حلال و حرام کے راویوں کا ثقہ، ثبت یا صدوق ہونا ضروری ہے، اسی طرح ترغیب و ترہیب کے راویوں کا بھی ان اوصاف حمیدہ سے متصف ہونا ضروری ہے۔ بس یہی دو تین محدثین ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ حدیث ضعیف پر بالکل عمل نہیں کیا جائے گا، اور مسلم ابن الحجاج صاحب الصحیح کے قول سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

اگر امام نووی رحمہ اللہ کے قول کو لیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ فضائل اعمال وغیرہ میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا اجماع فقہا و محدثین سے ثابت ہے تو ان دو تین محدثین کے اقوال جو منع کے قائل ہیں، اس باب میں معتبر نہ ہوں گے، اور اگر کوئی اس بات پر اتفاق نہ کرے تو کم از کم اسے اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ جمہور علما و محدثین اس بات کے قائل ہیں کہ احادیث ضعیفہ فضائل کے باب میں معتبر ہیں، اور ظاہر ہے کہ جمہور علما کا غلطی سے بعید ہونا اتنا ہی ممکن ہے جتنا کہ دو تین علما کا غلطی سے قریب ہونا، یہی وجہ ہے کہ آج تک علمائے کرام نے دو چند کے شذوذ کا اعتبار نہ کیے، اور جمہور علما کے نقش قدم پر قائم و دائم رہے اور یہی عقل مندی اور دانش مندی ہے۔

حدیث موضوع کب ہوگی؟ حدیث کے موضوع ہونے کے لیے محدثین کرام نے کچھ اصول و ضوابط بیان کیے ہیں، جن میں سے کسی ایک کا حدیث کے موضوع ہونے کے لیے پایا جانا ضروری ہے، ایسا نہیں ہے کہ ہوس کی پیروی کی اور جس حدیث کو چاہا جب چاہا موضوع قرار دے دیا، انہی ضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ اس حدیث میں علامات وضع میں سے کوئی ایک علامت پائی جائے، یہاں پر موضوع کی مناسبت سے، علامات وضع اختصار کے ساتھ ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اعلی حضرت امام احمد رضا قادری محدث بریلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (۱) کوئی حدیث اگر قرآن عظیم یا سنت متواترہ یا اجماع قطعی یا صریح عقل یا صریح حس یا تاریخ یقینی جو تاویل و تطبیق کا احتمال نہیں رکھتی، ان میں سے کسی ایک کے بھی خلاف ہو تو وہ حدیث موضوع ہوگی (۲) یا حدیث کا معنی قبیح ہو جس کا حضور ﷺ سے صدور ممکن نہیں (۳) یا حدیث ایسے امر پر مشتمل ہو کہ اگر اس کا وقوع ہوتا تو لوگوں کے درمیان مشہور و معروف ہو جائے مگر پھر بھی ایک روایت کے علاوہ کوئی دوسری روایت موجود نہیں (۵) یا روایت فعل حقیر کی وجہ سے کثیر مدح، یا امر صغیر کی وجہ سے شدید مذمت پر مشتمل ہو جس کا حضور

ﷺ کے کلام سے تشابہ نہ ہو (۶) یا حدیث کے الفاظ رکیک وخفیف ہوں کہ طبع سلیم اس کو قبول نہ کرے اور راوی اس بات کا مدعی ہو کہ بعینہ یہ حضور ﷺ کے الفاظ ہیں (۷) یا ایسی حدیث جو اہل بیت سے تعلق رکھتی ہے، جس کا ناقل رافضی ہے، اور وہ حدیث اس رافضی کے علاوہ کسی اور سے مروی نہیں (۸) یا قرائن حالیہ اس پر دال ہوں کہ آدمی نے غصہ یا لالچ کی وجہ سے فوری طور پر روایت گڑھی ہے (۹) یا یہ روایت استقرائے تام کے بعد کتب اسلامیہ میں نہ پائی جاتی ہو (۱۰) یا یہ کہ واضع خود حدیث وضع کرنے کا اقرار کرلے۔ (۲۶) تقریباً یہی علامات وضع 'دکتور الخشوعی الخشوعی صاحب نے بھی اپنی کتاب 'بحوث فی علوم الحدیث' میں ذکر کی ہیں، جو کلیۃ 'اصول الدین' کے سنۃ ثانیۃ میں داخل نصاب ہے۔

اگر مذکورہ بالا علامات وضع میں سے کوئی علامت نہ پائی جائے تو وہ روایت موضوع ہوگی یا نہیں اس مسئلہ میں محدثین کرام کے تین مذاہب ہیں۔

(۱) امام سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ صرف کذاب بلکہ وضاع کسی حدیث کی روایت کرنے میں متفرد ہو تو اس حدیث کو موضوع قرار نہیں دیا جائے گا، اگرچہ کوئی مدقق، ناقد وحافظ، فن حدیث میں درک رکھنے والا ماہر تام اپنی جہد مسلسل اور تفتیش کامل کے بعد یہ کہے کہ فلاں وضاع نے صرف یہ حدیث روایت کی ہے، کیونکہ استقرائے تام اس بات کو لازم نہیں کہ حدیث موضوع ہو، یا صرف وضاع ہی نے اس حدیث کو روایت کیا ہو، بلکہ حدیث کے موضوع ہونے کے لیے ضروری ہے کہ علامات وضع میں سے کوئی ایک علامت پائی جائے۔ (۲۷)

(۲) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کذاب اور وضاع جس کا کذب وافترا حضور ﷺ پر قصداً ثابت ہو چکا ہو، اگر ایسا شخص کوئی حدیث روایت کرے تو اس کے بارے میں ظن غالب کے اعتبار سے کہا جائے گا کہ اس کی روایت موضوع ہے، اور اگر اس کا کذب وافترا قصداً ثابت نہ ہو مگر وہ متہم بالکذب یا متہم بالوضع ہو تو اس کے بارے میں نہیں کہا جائے گا کہ اس کی روایت موضوع ہے، ہاں ایسا راوی متروک ضرور ہوگا۔ (۲۸)

(۳) اور بعض دیگر علما و محدثین کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی متہم بالکذب یا متہم بالوضع کسی روایت میں منفرد ہو تو وہ روایت موضوع قرار پائے گی، چنانچہ امام زرکشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر 'موسیٰ بن عبد العزیز' کا مجہول ہونا ثابت ہوجائے پھر بھی حدیث موضوع نہیں ہوگی جب تک کہ سند میں کوئی راوی متہم بالوضع نہ ہو۔ (۲۹)

خاتم الحفاظ امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگرچہ 'عبد الرحمن بن ابوبکر ملیکی' 'متروک' ہیں، مگر وہ متہم بالکذب نہیں کہ ان کی حدیث کو موضوعات سے شمار کیا جائے۔ (۳۰)

خلاصہ کلام: فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے تعلق سے مختلف مذاہب ہیں:

پہلا مذہب جس کی دو فرعیں ہیں: فرع اول: محدثین اور فقہائے کرام کا اجماع یا کم از کم جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ ضعیف حدیث اور کثرت خطا وغیرہ کی وجہ سے ضعیف شدید حدیث پر عمل کرنا جائز و مستحسن ہے۔ فرع ثانی: امام علائی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شدید ضعیف نہ ہو، اور اس پر اتفاق کا قول کیا ہے، مگر اس شرط پر اتفاق کا قول غیر مقبول ہے، کیونکہ امام نووی رحمہ اللہ اور دیگر ڈھیر سارے محدثین کی آرا جنہوں نے حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے لیے 'عدم ضعف شدید' کی قید نہیں لگائی ہے، اس اتفاق کے قول کو مخدوش کر دیتی ہے، نیز خود امام علائی، ابن حجر عسقلانی، جلال الدین سیوطی اور سخاوی رحمہم اللہ جنہوں نے یہ قید یا شرط ذکر کی ہے ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ دوسرا مذہب: دو تین علمائے کرام اس امر کے قائل ہیں کہ حدیث ضعیف پر مطلقاً عمل کرنا درست نہیں۔ مگر راجح اور صحیح جمہور ہی کا مذہب ہے۔

لہٰذا جس نے بھی 'حدیث ضعیف' یا 'شدید ضعیف' پر عمل نہ کرنے کی رغبت دلائی وہ اپنی اس فکر میں خاطی اور غیر مصیب ہے، دور حاضر کے ایک عالم کا مقالہ "تقریروں میں موضوع روایات ایک لمحہ فکریہ" پڑھنا میسر آیا، ان کی یہ پیش قدمی اچھی کہی جاسکتی ہے، 'احادیث موضوعہ' پر اصلاح کی غرض سے لکھنے کی ضرورت ہے، مگر اس کے ضمن میں منہج علمی سے انحراف کرکے علمائے کرام پر جملے کسنا یا احادیث ضعیفہ شدیدہ اور غیر شدیدہ کو موضوعات سے شمار کرنا یا اس سے دست بردار ہونے کی رغبت دلانا یا تشدد و تعنت برتنا یا اس کے لیے راہ ہموار کرنا یقیناً غیر سلیم ہے، چنانچہ صاحب مقالہ اپنے گمان کے مطابق ہندوستان کے بعض افراد کی اصلاح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ابھی کچھ دن

پہلے ہمارے ایک محترم بزرگ نے مجھ سے کچھ حدیثوں کی تحقیق چاہی میں نے ان کی مطلوبہ حدیثوں کی تخریج کر دی اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ ان میں فلاں فلاں حدیث ضعیف و منکر ہے اس کو آپ بیان نہ ہی کریں تو بہتر ہے، اس پر انہوں نے جو جواب دیا وہ ہمارے عام ذہن اور مزاج کی عکاسی کرتا ہے، انہوں نے فرمایا کہ ارے تو کیا ہوا ان سے سرکار ﷺ کی فضیلت ہی تو ثابت ہو رہی ہے، کوئی توہین تھوڑی ہو رہی ہے''۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''معراج شریف کے سلسلہ میں صحیحین اور دیگر کتب صحاح میں اتنی تفصیل اور کثرت سے روایات موجود ہیں کہ وہ اس واقعے کے سلسلے میں ہمیں ضعیف احادیث سے مستغنی کر دیتی ہیں''۔

مجھے اس جمہور مخالف فکر سے اتفاق نہیں، اور نہ ہی کوئی طبع سلیم کا مالک اس فکر سے اتفاق کر سکتا ہے کیونکہ:

(الف) صاحب مقالہ کا کہنا کہ 'ان میں فلاں فلاں حدیث ضعیف و منکر ہے اس کو آپ بیان نہ ہی کریں تو بہتر ہے'' یا یہ کہنا کہ ''اس واقعے کے سلسلے میں (صحیح حدیثیں) ہمیں ضعیف احادیث سے مستغنی کر دیتی ہیں'' اجماع یا کم سے کم جمہور محدثین سے شذوذ و انحراف ضرور ہے، کیونکہ جمہور محدثین اسی بات کے قائل ہیں کہ فضائل میں حدیث ضعیف شدید و غیر شدید پر عمل کرنا بہتر و مستحسن ہے، اور وہ اسی کی طرف رغبت دلاتے رہے ہیں۔

(ب) صاحب مقالہ کے 'محترم بزرگ' کا جواب جس عام ذہن کی عکاسی کرتا ہے وہی درست اور صحیح ہے، کیونکہ وہی مذہب جمہور کا علمبردار ہے، نہ کہ مقالہ نگار کی جدید فکر۔

(۲) جس حدیث میں شدت ضعف راوی کی کثرت خطا یا غفلت یا فسق کی وجہ سے ہو وہ حدیث بھی فضائل کے باب میں معتبر ہو گی، کیونکہ یہی رائے جمہور علما و محدثین کی ہے۔

(۳) حدیث کے موضوع ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں وضع حدیث کی علامتوں میں سے کوئی ایک علامت پائی جائے، جس حدیث میں ان میں سے کوئی علامت پائی گئی اس پر عمل کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہ ہوگا۔

(۴) اگر علامت نہ پائی جائے تو حدیث کب موضوع ہوگی اس میں تین مذاہب ہیں:

(الف) امام سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سند میں وضاع ہو تو بھی حدیث کو موضوع نہ کہیں گے (ب) امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جس راوی کا حضور ﷺ پر قصداً افترا ثابت ہو اس کی حدیث موضوع ہوگی (ج) امام زرکشی اور امام سیوطی رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ جس پر وضع یا جھوٹ کی تہمت لگائی گئی ہو اس کی حدیث موضوع قرار پائے گی۔

پہلا مذہب اسلم ہے، کیونکہ وضاع کے منفرد ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس نے حدیث وضع ہی کی ہو یا کسی اور نے اس کے سوا روایت ہی نہ کی ہو، ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر کوئی راوی وضاع یا کذاب، متہم بالکذب یا متہم بالوضع کسی حدیث کی روایت کرنے میں منفرد ہو اور اس میں علامت وضع نہ پائی جائے تو اس کی حدیث پر عمل نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ایسی حدیثیں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ یا خاتم الحفاظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کے نزدیک موضوع حدیث کے شمار میں آتی ہیں۔

تنبیہ اول: راوی وضاع یا کذاب، متہم بالکذب یا متہم بالوضع کسی روایت میں منفرد ہو اور اس میں علامت وضع نہ پائی جائے تو اس کی حدیث کو رد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نقاد و محدثین کے اس راوی کے بارے میں وارد شدہ نقد کی چھان بین کی جائے پھر کوئی حکم لگایا جائے، فقط کسی ایک کے قول پر اعتماد کر کے خاص طور سے جب کہ وہ متشدد یا متساہل ہوں جیسے امام ابن حبان رحمہ اللہ، حدیث کا رد کر دینا جہاں مناہج محدثین سے ناواقفیت کی دلیل ہے وہیں یہ طریقہ کار خطا سے خالی نہیں۔

تنبیہ ثانی: احادیث موضوعہ کی علامات میں سے ایک علامت یہ ہے کہ حدیث صریح عقل کے خلاف ہو، اس باب میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں کہ حدیث کے صریح عقل کے خلاف ہونے کا فیصلہ کرے۔ نیز ناقد حدیث کے لیے ضروری ہے کہ عقل کسی حدیث کے ورود کو محال سمجھے یا عقل اس کا ادراک نہ کر سکے، ان دونوں کے درمیان تفریق کرے، کیونکہ شریعت اسلامیہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو عقل محال سمجھے، ہاں ایسا کبھی ہوتا ہے کہ عقل اس کے ادراک سے قاصر ہوتی ہے۔ اسی حذر کی طرف

ڈاکٹر الخشوعی الخشوعی صاحب نے اپنی کتاب "بحوث فی علوم الحدیث" میں بھی اشارہ فرمایا ہے۔ لہذا اگر عقل سلیم حدیث کے ورود کو محال جانے تو اس پر موضوع ہونے کا حکم لگایا جائے اور اگر ادراک نہ کر سکے تو کف لسان ضروری ہے۔

بہر حال میں اپنی اس بحث سے یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں ان متساہلین کی تائید کرتا ہوں جو احادیث موضوعہ پر قصداً یا عدم علم کی وجہ سے عمل کرتے ہیں، بلکہ میں ان پر عمل کرنے والوں کی سخت مذمت کرتا ہوں، جو لوگ عدم علم کی بنا پر ایسا کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ علماے حدیث کی طرف رجوع کرکے احادیث کے احکام معلوم کریں اور پھر اسی اعتبار سے عمل اور بیان کریں اور جو لوگ قصداً ایسا کرتے ہیں ان کے لیے وعید شدید ہے، انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے عبرت حاصل کرنا چاہیے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، جس نے مجھ پر عمداً جھوٹ باندھا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ (متفق علیہ) لہذا ایسے لوگوں پر واجب ہے کہ وہ فوراً اپنے اس عمل سے دست بردار ہوں اور توبہ کریں اور نہ ان متشددین کی موافقت کرتا ہوں جو ضعیف حدیث اور کثرت خطا وغیرہ کی وجہ سے ضعیف شدید حدیث کو موضوع قرار دیتے ہیں یا اس پر عمل کرنے سے منع کرتے ہیں، کیونکہ ایسی صورت میں امت مسلمہ بہت سارے فضائل سے محروم ہو جائے گی، بلکہ میں افراط و تفریط سے دور مسلمانوں کو وسطیت اور اعتدال اپنانے کی دعوت دیتا ہوں، وہ اس طرح کہ احادیث صحیحہ پر عمل کرنے کا التزام کریں اور ساتھ ہی ضعیف حدیثوں میں وارد فضائل پر بھی توجہ دیں تاکہ ان کے فوائد سے محروم نہ ہوں۔ □□□

مصادر و مراجع

(۱) فتح المغیث للسخاوی، ج ۱ ص ۳۳۴، مطبع: المکتبۃ التوفیقیۃ، القاہرۃ، مصر۔
(۲) تدریب الراوی للسیوطی، النوع الثانی والعشر ون، ص ۲۵۸، مطبع: دار الحدیث القاہرۃ، مصر۔
(۳) فتح المغیث، ج ۱ ص ۳۳۴، حاشیۃ الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ محمد عبد الحی اللکنوی، ص ۴۸، ۴۹، مطبع: دار البشائر الاسلامیۃ، بیروت، لبنان، بحوث فی علوم الحدیث ص: ۱۰-۲۹۔
(۴) فتح المغیث، ج ۱ ص ۳۳۴۔
(۵) الاذکار للنووی ص ۷، ثالث فصول المقدمۃ، مطبع: مکتبۃ مصطفی البابی الحلبی۔
(۶) الھاد الکاف لاحمد رضا البریلوی، نقلاً عن الحلیۃ شرح المنیۃ، ص ۹۴، تحقیق: تاج الشریعہ ازہری میاں، مطبع: دار الحاوی، بیروت، لبنان۔
(۷) تدریب الراوی، النوع الثانی والعشر ون، ص ۲۵۸۔
(۸) الھاد الکاف ص ۱۲۹ نقلاً عن شرح المواھب اللدنیہ۔
(۹) شرح علل الترمذی لابن رجب الحنبلی، ص ۶۷، مطبع: عالم الکتب، بیروت، لبنان۔
(۱۰) فتح القدیر ج ۲ ص ۱۷۸، باب الامامۃ۔
(۱۱) جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبد البر، ج ۱ ص ۵۳، باب تفضیل العلم علی العبادۃ، مطبع: دار ابن حزم۔
(۱۲) الاسرار المرفوعۃ ص ۳۱۵، رقم الحدیث: ۴۳۴: مسح الرقبۃ، مطبع موسسۃ الرسالۃ۔
(۱۳) تدریب الراوی النوع الثانی والعشر ون، ص: ۲۵۸۔
(۱۴) الھاد الکاف فی حکم الضعاف، ص: ۴۴۔
(۱۵) تدریب الراوی، النوع الثانی والعشر ون، ص: ۲۵۸۔
(۱۶) اللآلی المصنوعۃ ج ۱ ص ۲۳۸، مطبع: دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔
(۱۷) اللآلی المصنوعۃ ج: ۱، ص: ۴۲۱۔
(۱۸) تقریب التھذیب ص ۶۸۳، مطبع: دار الحدیث، القاہرۃ، مصر، نزھۃ النظر شرح نخبۃ الفکر ص ۵۲، مطبع: مکتبۃ الرحاب، القاہرۃ، مصر۔
(۱۹) النکت البدیعات للسیوطی، ص: ۳۲۱، مطبع: دار الجنان۔
(۲۰) القول البدیع للسخاوی ص ۴۹۷، مطبع: دار الیسر، المدینۃ المنورۃ۔
(۲۱) بحوث فی علوم الحدیث للدکتور الخشوعی الخشوعی ص: ۲۳۔
(۲۲) قواعد التحدیث من فنون علوم الحدیث للقاسمی ص ۱۱۶، مطبع: دار النفائس، بیروت، لبنان۔
(۲۳) قواعد التحدیث من فنون علوم الحدیث، ص: ۱۱۶۔
(۲۴) الاجوبۃ الفاضلۃ ص: ۵۳۔
(۲۵) شرح علل الترمذی، ص: ۷۷۔
(۲۶) الھاد الکاف ۶۸-۸۱۔
(۲۷) فتح المغیث للسخاوی ج: ۱، ص: ۲۱۵۔
(۲۸) نزھۃ النظر شرح نخبۃ الفکر، ص: ۴۸۔
(۲۹) اللآلی المصنوعۃ للسیوطی، ج: ۲، ص: ۳۸۔
(۳۰) النکت البدیعات للسیوطی، ص: ۱۸۲۔

پہلی قسط

شیخ العلما علامہ غلام جیلانی: ایک ملاقات

شیخ العلماء حضرت علامہ الحاج غلام جیلانی علیہ الرحمہ سابق (شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف، یوپی) سے ان کی علمی و دینی خدمات اور رائج نصاب کے سلسلے میں **مولانا محمد عاصم اعظمی** (استاذ: مدرسہ شمس العلوم، گھوسی، مئو) نے حضرت موصوف کے انتقال پر ملال سے چند ماہ قبل انٹرویو کیا تھا، جس کی اشاعت ماہ نامہ "فیض الرسول" براؤں کے شیخ العلماء نمبر (اپریل، مئی ۱۹۷۷ء) میں ہوئی تھی۔ رسالہ مذکور کے شکریے کے ساتھ یہ معلوماتی انٹرویو قارئین جام نور کی نذر ہے۔ (ادارہ)

اعظم گڑھ (یوپی) کا مردم خیز ضلع جس طرح ماضی میں علم وادب کا محور و مرکز رہا ہے جہاں عظیم شاعر، ادیب، فقیہ، محدث، مفسر، فلفی، مورخ، غرض کہ جملہ علوم وفنون پر کامل دست گاہ رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، موجودہ علمی زوال کے دور میں بھی اس خاک سے علم وفن اور فضل وکمال کے آفتاب وماہتاب طلوع ہو کر دنیائے علم وفضل کو روشنی بخش رہے ہیں، جس کی ترجمانی اقبال سہیل نے اپنے ایک مشہور شعر میں کی ہے:

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

اسی اعظم گڑھ کا ایک قدیم گہوارۂ علم وفن قصبہ گھوسی ہے، اس قصبہ کی قدامت کی طرح یہاں کی علمی تاریخ بھی قدیم ہے۔

زمانہ دراز سے آج تک کوئی ایسا دور نہیں گزرا جو اصحاب علم وفن سے خالی رہا ہو، انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر سے لے کر موجودہ صدی تک کا زمانہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

قصبہ گھوسی کا ایک چھوٹا سا محلہ کریم الدین پور ہے جسے علمی دنیا میں اہم ترین حیثیت حاصل ہے، اس مختصری آبادی نے علما ومشائخ کی ایک ایسی جماعت ہمیشہ پیدا کی ہے جو ہندو پاک کے طول وعرض میں علوم اسلامیہ کی تدریس اور دین اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں مصروف ہے، انھی علما ومشائخ میں حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے وقت کے جلیل القدر عظیم المرتبت عالم دین شیخ العلما حضرت علامہ مولانا غلام جیلانی صاحب شیخ الحدیث (دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف، ضلع بستی) بھی ہیں، جنھوں نے اپنے پچاس سالہ دور تدریس میں ملک کی موقر اور عظیم درس گاہوں میں منصب درس پر فائز رہ کر علمائے کرام کی ایک عظیم جماعت پیدا کی جو ملک وبیرون ملک میں تشنگان علم کو سیراب کر رہی ہے۔

۴؍شوال المکرم ۱۳۹۶ھ کو ایک تقریب میں شرکت کے لیے مولانا نثار احمد صاحب، مولانا محب الحق صاحب قادری، مولانا علی احمد صاحب اعظمی، حافظ تشریف الاعظم صاحب اور راقم السطور حضرت موصوف کی خدمت میں پہنچے، راستے میں تذکرہ آیا کہ اکابر علما ومشائخ میں اکثر حضرات پر تعارفی مضامین یا خود ان سے انٹرویو اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، مگر حضرت مولانا موصوف سے متعلق اب تک کوئی مضمون یا انٹرویو شائع نہ ہو سکا، اگر حضرت اجازت مرحمت فرمائیں تو کچھ سوالات پیش خدمت کر کے جواب حاصل کیا جائے اور انھیں مضمون کی شکل دے دی جائے۔ جس سے حضرت مولانا موصوف کا قلمی تعارف ارباب علم اور اردو خواں طبقہ تک پہنچ سکے اور حضرت کی علمی ودینی خدمات ملک کے سامنے آجائیں۔

طے شدہ پروگرام کے پیش نظر سلام ودست بوسی کے بعد احباب نے مل جل کر انٹرویو کے لیے سوالات کی ایک طویل فہرست تیار کی جسے حضرت مولانا موصوف کی خدمت میں پیش کر دیا گیا، ملاحظہ فرمانے کے بعد حضرت نے ارشاد فرمایا نقاہت اور کمزوری کے باعث فی الحال جواب تو نہیں دے سکتا، ہاں! جوابات تحریری شکل میں ان شاء اللہ ضرور دے سکتا ہوں، ہم نے بھی حضرت کی معذوری کو محسوس کیا، لیکن انٹرویو کے چند سوالات جو ضروری تھے اور ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنی تھیں اس لیے ہم نے ان سوالوں کے جوابات دریافت کیے۔ حضرت مولانا موصوف نے مرض اور کمزوری کے باوجود سوالوں پر نظر ثانی کے بعد جواب عنایت فرمانے شروع کر دیے۔ ہمارا پہلا سوال حضرت کی ولادت اور

بچپن کے واقعات سے متعلق تھا جس کے جواب میں ارشاد ہوا:

میں محلہ کریم الدین پور گھوسی میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوا، بچپن کا زمانہ انتہائی غربت میں گزرا، اس لیے کہ میرے والد حضرت مولانا محمد صدیق صاحب علیہ الرحمہ کا انتقال میری ابتدائی عمر ہی میں ہو چکا تھا جب کہ میری عمر زیادہ سے زیادہ نو برس کی رہی ہوگی، میری اور میرے برادر عزیز مولانا غلام یزدانی صاحب مرحوم کی کفالت اور تعلیمی مصارف کا پورا پورا بوجھ میری نیک بخت ماں پر پڑا، جو اپنی جسمانی قوت کے مطابق گھریلو کام کر کے اپنا اور ہمارا پیٹ پالتی رہیں اور بلند حوصلہ مادر مہربان نے تنگ دستی کے باوجود ہماری تعلیم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور انہی کا کرم اور شفقت ہے کہ ہم اس منصب تک پہنچے۔ جب حضرت مولانا محمد صدیق صاحب کا ذکر آیا تو ہم انٹرویو کے وہ سوالات جو مولانا محمد صدیق صاحب کے متعلق تھے یکے بعد دیگرے پیش خدمت کرتے رہے اور حضرت مولانا ان کے جوابات مرحمت فرماتے رہے۔

چونکہ حضرت والد بزرگوار کا انتقال میری کمسنی ہی میں ہو چکا تھا اس لیے میں ان کے بارے میں ذاتی مشاہدات کی بنیاد پر زیادہ یادداشت پیش کرنے سے قاصر ہوں، ہاں! سن شعور کو پہنچنے کے بعد اساتذہ اور دوسرے خاندانی بزرگوں سے جو حالات و واقعات مجھے معلوم ہوئے اسے عرض کیے دیتا ہوں:

والد بزرگوار حضرت مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم جون پور مدرسہ حنفیہ کے ممتاز اور ارشد تلامذہ میں تھے، استاذ العلما حضرت مولانا ہدایت اللہ صاحب رام پوری علیہ الرحمہ (استاذ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ جو اس وقت صدر مدرس تھے) جن کے تبحر علمی اور درس و تدریس کا شہرہ فقط دیار پورب ہی نہیں بلکہ ہند کے دور افتادہ علاقوں میں بھی تھا جن کی درس گاہ سے سیکڑوں علم و فضل کے ایسے آفتاب و ماہتاب طلوع ہوئے جن کی چمک دمک نے لاکھوں تاریک دلوں کو روشنی بخشی اور انہیں دولت علم سے بہرہ یاب کیا وہ حضرت والد گرامی کے ذوق و شوق علمی اور ذہانت و فطانت سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی تنخواہ سے پانچ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر فرما دیا تھا اور والد بزرگوار کی سادگی و پاکیزگی نفس کی بنا پر خلوص کے نام سے یاد کرتے۔

میرے والد بزرگوار جب مبارک پور بسلسلۂ تدریس پہنچے تو وہاں کے بیدار مغز اور زندہ دل مسلمانوں میں ذوق علم پیدا کیا اور انہیں بڑے مدرسہ کے قیام پر ابھارا جس کے نتیجہ میں ایک ادارہ کا قیام عمل میں آیا جو مولوی محمد عمر سبزی فروش کے ذاتی مکان میں کھولا گیا، جس کا نام "دار العلوم مصباح العلوم" رکھا گیا، والد گرامی نے عرصہ دراز تک اس ادارے میں اپنی علمی خدمات پیش کیں اور بہت سے تشنگان علم نے ان سے کسب فیض کیا۔ والد گرامی کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد مولانا عبد السلام صاحب صدر مدرس ہوئے، لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور وہ بھی انتقال کر گئے۔ مولانا عبد السلام صاحب کے انتقال کے بعد مدرسہ مقفل ہو گیا، صاحب مکان نے دیوبندیوں کو مکان فروخت کر دیا (حالانکہ اس مکان کو انہوں نے زبانی طور پر مدرسہ مصباح العلوم کے لیے وقف کر دیا تھا) اس طرح دار العلوم مصباح العلوم ایک چھوٹے سے مکتب کی شکل اختیار کر گیا جو لوگوں کے ذاتی مکان میں منتقل ہوتا رہا اور جس میں معمولی ابتدائی تعلیم ہوتی رہی۔ حضرت والد بزرگوار کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان میں درج ذیل اشخاص کے نام یہ ہیں:

(۱) مولانا عبد السلام صاحب مرحوم (۲) مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی (مصنف الافادات القدسیہ) قابل ذکر ہیں۔ (۳) مولانا محمد یحیٰی بلیاوی صاحب (۴) مولانا عبد الحی بلیاوی صاحب (علامہ ارشد القادری صاحب کے عزیز قریب) اور مولانا غلام غوث صاحب بلیاوی، مولانا عبد العظیم صاحب بنگلہ دیش، بھی آپ کے تلامذہ میں ہیں۔

مولانا محمد شریف صاحب سے مجھے ملنے کا جب بھی اتفاق ہوتا وہ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور بڑی محبت کے ساتھ پیش آتے اور فرماتے آپ میرے استاذ زادے ہیں۔ آپ کے والد گرامی کے معاصرین میں حضرت مولانا نذیر احمد صاحب عرف نوشہ میاں علیہ الرحمہ، مولانا یوسف صاحب مرحوم، مولانا ہدایت اللہ صاحب مرحوم، حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ، مولانا محمد عمر صاحب علیہ الرحمہ اور دیگر مشاہیر علمائے گھوسی تھے جن میں ہر ایک معاصر سے آپ کے تعلقات انتہائی خوش گوار رہے جو والد گرامی کی انتہائی شرافت طبع اور سنجیدگی مزاج کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

ہم نے اگلا سوال حضرت کی تحصیل علم اور فراغت سے متعلق کیا تو آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ جواب عطا فرمایا:

بسم اللہ حاجی ضیاء الدین صاحب مرحوم نے کرائی اور انہی کے

پاس میں نے قرآن مجید ختم کیا اور کچھ اردو کی کتابیں بھی انہی سے پڑھیں- والد بزرگوار کے انتقال کے بعد میں مبارک پور پڑھنے گیا، جہاں مولانا عبد السلام صاحب تلمیذ رشید حضرت مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم سے فارسی کی پہلی ،آمد نامہ وغیرہ کتابیں پڑہیں ،لیکن استاذ گرامی کے انتقال کے بعد میں گھوسی واپس آگیا اور قصبہ کوپا گنج کے ایک مدرسہ میں داخلہ لے کر مولانا عبد الصمد صاحب سے میزان ونج گنج تک تعلیم حاصل کی-کوپا گنج کے بعد میں نے گھر ہی میں مقیم رہ کر بیسواڑہ گھوسی کے رئیس عبدالحیٔ صاحب کے مکان پر قائم شدہ مدرسہ میں داخلہ لے لیا اور تقریباً دوسال وہیں تعلیم حاصل کی-حضرت مولانا محمد عمر صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان اور مولانا ظہیر صاحب سے نحو میر، شرح مائۃ عامل اور ہدایۃ النحو پڑھی، اس کے بعد میں حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے ہمراہ بریلی شریف گیا- غالباً شوال ۱۳۳۹ھ تھا جہاں دارالعلوم منظر الاسلام میں حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ، مولانا حسنین رضا خاں صاحب، مولانا عبدالعزیز صاحب بجنوری علیہ الرحمہ سے شرح جامی، تفسیر جلالین، شرح عقائد نسفی ، رسالہ میر زاہد، میر زاہد ملا جلال، شرح ہدایت الحکمۃ ،شرح وقایہ، ہدایہ اولین، اصول الشاشی، نور الانوار، حسامی، مشکوٰۃ شریف پڑھی اور جب حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ اجمیر شریف جامعہ معینیہ کی تدریسی خدمات کے لیے تشریف لے گئے تو میں بھی آپ کے ساتھ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں اجمیر شریف گیا- مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم پسر حضرت صدر الشریعہ ہمراہ سفر تھے ،اجمیر شریف میں حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ اور مولانا عبدالحیٔ (افغانی) اور مولانا عبداللہ (افغانی) صاحبان سے مختصر المعانی، میر زاہد، (دوبارہ) اور چند دوسری کتابوں کا درس لیا-

سالانہ امتحان میں میں نے اول درجہ سے کامیابی حاصل کی اور مدرسہ کی جانب سے مجھے کتابوں کا انعام بھی ملنے والا تھا، مگر میں دوسرے سال اجمیر شریف نہ جاسکا، بلکہ فرنگی محل لکھنؤ کے مدرسہ نظامیہ میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرنے لگا- جہاں میں نے شرح عقائد، دیوان متنبی، حماسہ، سبعہ معلقہ، مدارک التنزیل، مسلم الثبوت، صدریٰ، حمد اللہ، حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی سجادہ نشیں، حضرت مولانا عبد القادر فرنگی محلی مرحوم، حضرت مولانا عنایت اللہ صاحب، مولانا صبغۃ اللہ صاحب اور مولانا قطب الدین صاحب سے پڑھیں-

فرنگی محل میں مسلم الثبوت تک تحریری امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیابی پر حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی صاحب نے نو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا- آئندہ سال دورۂ حدیث اور تکمیل کے لیے ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم منظر الاسلام بریلی شریف میں داخل ہوگیا، جہاں شاہزادۂ اعلیٰ حضرت حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں صاحب اور حضرت مولانا رحم الٰہی صاحب مرحوم صدر مدرس سے بخاری شریف، مسلم شریف، ابن ماجہ، نسائی، ابوداؤد، بیضاوی شریف، توضیح وتلویح کا درس لیا اور ۱۳۴۵ھ میں ہی سند فراغت حاصل کی-

ہمارا اگلا سوال تھا آپ کے وہ اساتذۂ کرام جن کے فیض تعلیم و تربیت سے آپ متاثر ہوئے اور جن کا نقش آج بھی آپ کے لوح دل پر محفوظ ہے- حضرت شیخ العلما نے اس سوال پر قدرے تامل کیا اور ارشاد فرمایا میرے اساتذۂ کرام کی ایک طویل فہرست ہے، لیکن میں نے مختلف علوم وفنون میں جن کو زیادہ کامل پایا اور جن کے فیض علم سے میں نے اثر قبول کیا ان میں سر فہرست حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی بلند پایہ شخصیت ہے جو درس نظامی کے مروجہ جملہ علوم وفنون پر کامل دست گاہ رکھتے تھے- حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی معقولات اور فن تفسیر پر کافی عبور رکھتے تھے، مولانا صبغۃ اللہ صاحب ادب کے بے مثال استاد تھے- ان بزرگوں کے علاوہ حضرت حجۃ الاسلام اور مولانا رحم الٰہی ومولانا عبدالحیٔ افغانی معقولات میں خاص مہارت اور دستگاہ رکھتے تھے، انہی بزرگوں کے فیضان علم نے مجھے علم وفضل کی دولت گراں مایہ سے نواز کر کسی لائق بنا دیا-

تحصیل علم کے بعد حضرت شیخ العلما کی زندگی کا گراں قدر حصہ تدریسی خدمات کی انجام دہی اور نئی نسل کو زیور علم سے آراستہ کرنے میں گزرا ہے اور اس سلسلہ میں آپ نے مختلف مدارس میں اپنی خدمات پیش کی ہیں، لہذا ہم نے تدریسی لائف سے متعلق سوال پیش کیا-

حضرت نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلے میرا تقرر ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم منظر اسلام بمشاہرہ پانچ روپیہ ہوا، لیکن صرف پانچ مہینہ قیام کے بعد میں مدرسہ محمدیہ امروہہ ضلع مراد آباد بمشاہرہ تیس روپیہ ماہوار بحیثیت نائب مدرس مقرر ہوا اور تقریباً سات برس تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد اسی تنخواہ پر مدرسہ محمدیہ ویلور (مدراس) چلا گیا جہاں مجھے مولوی فاضل کی کلاسوں پر عربی ادب کا معلم مقرر کیا گیا، لیکن نا مساعد

آب وہوا اور خرابی صحت کے باعث ایک سال رہ کر پھر امروہہ آگیا وہاں سے ایک سال بعد حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے حکم سے مدرسہ احسن العلوم کان پور چلا گیا، جہاں چھ سال تک تدریسی وتبلیغی خدمات انجام دیتا رہا-۱۳۶۱ھ میں مجھے مدرسہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ شریف ضلع ایٹہ احسن العلما حضرت مولانا حسن میاں صاحب قبلہ سجادہ نشیں کی تعلیم کے لیے بلا گیا جہاں ایک سال قیام رہا-حضور مفتی اعظم ہند نے ۱۳۶۲ھ میں جامعہ نوریہ مظہر اسلام بریلی شریف بلالیا، وہاں سے پھر ۱۳۶۶ھ میں دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں میرا تقرر ہوا، جہاں میں نے تقریباً سات برس تدریسی خدمات انجام دی-۱۳۷۳ھ میں میرا تقرر جامعہ عربیہ ناگ پور ہوا، مگر وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی-حضور مفتی اعظم کے حسب حکم دوبارہ دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے حاضر ہوا اور تقریباً پانچ سال تک جامعہ رضویہ کی تدریسی خدمات انجام دیتا رہا، پھر شعیب الاولیا حضرت خواجہ صوفی شاہ محمد یار علی صاحب قبلہ قدس سرہ العزیز کے ادارہ دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف سے میری طلبی کے مراسلات جانے لگے حتی کہ وہاں کے مدرس مولوی محمد یونس صاحب نعیمی اشرفی مجھے لینے کے لیے بریلی شریف پہنچے اور مجھے براؤں شریف ساتھ میں لائے-۱۳۷۹ھ میں بحیثیت شیخ الحدیث میرا تقرر دار العلوم اہل سنت فیض الرسول براؤں شریف میں بمشاہرہ ۱۲۵/روپیہ اور اب ۳۰۵ روپیہ ماہوار مجھے ملتے ہیں- تاہنوز تدریسی خدمات انجام دے رہا ہوں، یہاں کے روحانی ماحول میں انتہائی سکون اور قلبی استراحت محسوس کرتا ہوں-حضرت شعیب الاولیا کی بیکراں شفقت میرے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوگئی ہے، ان کے وصال کے بعد ان کی ابدی آرام گاہ کا قرب میرے لیے سکون جان ہے، خدا نے چاہا تو زندگی کے آخری ایام بھی اسی مقدس سرزمین سے وابستہ رہ کر دار فانی کو خیر باد کہوں گا-

حضرت شیخ العلما نے تحصیل علم سے پہلے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہی تدریسی زندگی اختیار کرلی تھی اور تاہنوز ملک کے مختلف اداروں میں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، اس لیے فطرتاً یہ سوال اٹھتا ہے کہ حضرت کے فیض تعلیم وتربیت سے آراستہ ہونے والے اور علوم اسلامیہ کی دولت سے مالا مال ہونے والے مشاہیر علما وتلامذہ کون کون سے ہیں؟ چنانچہ ہم نے اگلا سوال تلامذہ کے بارے ہی میں کیا جس کے جواب میں ارشاد ہوا:

ملک کے مختلف گوشوں میں میرے تلامذہ کی معتدبہ تعداد موجود ہے، جن کی تفصیلی فہرست بہرحال استحضار کی متقاضی ہے تاہم کچھ لوگوں کے نام یہ ہیں:

(۱) مولانا غلام یزدانی سابق شیخ الحدیث دار العلوم مظہر اسلام، بریلی (۲) مولانا عبد المصطفیٰ اعظمی، شیخ الحدیث منظر حق ٹانڈہ (۳) مولانا حافظ عبد الرؤف بلیاوی سابق نائب شیخ الحدیث دار العلوم اشرفیہ مبارک پور (۴) مولانا سید احمد سعید کاظمی (۵) مولانا صوفی غلام آسی پیا (۶) مولانا قاری محمد عثمان اعظمی مبلغ اعظم الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور (۷) مولانا ضیاء المصطفیٰ قادری سجادہ نشیں آستانہ امجدیہ واستاذ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور (۸) مولانا ریحان رضا خاں ایم ایل سی، بریلی شریف (۹) مولانا قاری رضاء المصطفیٰ دار العلوم امجدیہ کراچی (۱۰) مولانا سید محمد مدنی میاں سجادہ نشیں آستانہ محدث اعظم ہند (۱۱) مولانا سید مصطفیٰ حیدر حسن آستانہ مارہرہ شریف (۱۲) مولانا تحسین رضا خاں نائب شیخ الحدیث دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف (۱۳) مولانا سبطین رضا بریلی شریف (۱۴) مولانا مجیب الاسلام نسیم قادری (۱۵) مولانا قمر الدین اشرفی، صدر مدرس شمس العلوم گھوسی (۱۶) مولانا محمد میاں کامل سہرامی (۱۷) مولانا بدر الدین صدر مدرس مدرسہ غوثیہ بڑھیا (۱۸) مولانا محمد احمد مشاہدی (۱۹) مولانا عبد اللہ خان استاذ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور (۲۰) مولانا صوفی نظام الدین استاذ مدرسہ تنویر الاسلام امرڈوبھا (۲۱) مولانا اعجاز احمد خاں صدر مدرس مدرسہ تدریس الاسلام بسڈیلہ (۲۲) مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی شیخ الحدیث مدرسہ نظامیہ بھاگل پور (۲۳) مولانا مجیب اشرف بانی ومہتمم دار العلوم امجدیہ ناگ پور (۲۴) مولانا سید کمیل اشرف (۲۵) مولانا محمد صابر القادری نسیم بستوی (۲۶) مولانا قدرت اللہ استاذ دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف (۲۷) مولانا نعیم الدین صدیقی شیخ الحدیث دار العلوم تنویر الاسلام امرڈوبھا بستی (۲۸) مولانا محمد اسلم مظفر پوری (۲۹) مولانا غلام عبد القادر علوی صاحبزادہ حضرت شعیب الاولیا علیہ الرحمۃ (۳۰) مولانا محمد رمضان (۳۱) مولانا محمد سالم صدر مدرس مدرسہ امجدیہ (۳۲) مولانا محمد عمر مبارک پوری (۳۳) مولانا سبحان اللہ

(۳۴) مولانا شمس الدین اعظمی (۳۵) مولانا ابوطلحہ مبارک پور (۳۶) مولانا سخاوت علی (۳۷) مولانا شفیع احمد اوروی مرحوم (۳۸) مولانا خلیل احمد (۳۹) مولانا کمال احمد بستوی (۴۰) مولانا کاظم علی (۴۱) مولانا غلام ربانی مہتمم دارالعلوم غوثیہ ہبلی (۴۲) مولانا تجمل ہدیٰ نائب شیخ الحدیث منظرحق ٹانڈہ (۴۳) مولانا محمد سید احمد انجم استاذ دارالعلوم فیض الرسول (۴۴) مولانا سید منظور احمد (۴۵) مولانا نثار احمد استاذ دارالعلوم امجدیہ ناگ پور (۴۶) مولانا انوار احمد استاذ مدرسہ خیریہ فیض عام گھوسی (۴۷) مولانا حفیظ اللہ استاذ مدرسہ احسن المدارس کان پور (۴۸) مولانا سمیع اللہ (۴۹) مولانا شفیق احمد (۵۰) مولانا شاہ المصطفیٰ صاحبزادہ حضرت صدرالشریعہ (۵۱) مولانا سید ذوالفقار (مکن پوری) (۵۲) مولانا سید اظہار اشرف (۵۳) مولانا اختر حسن (۵۴) حکیم غلام مصطفیٰ صاحب (۵۵) مولانا مقبول احمد۔

تلامذہ کی فہرست میں اختصار کرتا ہوں ورنہ میرے شاگردوں کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار ہوگی۔

ملک کے اندر روز بروز دینی اداروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، چھوٹے چھوٹے مکاتب بڑے بڑے اداروں میں تبدیل ہورہے ہیں اور ہر ہر گاؤں میں مکتب اور مدرسے قائم ہیں، لیکن اداروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود علما گھٹ رہے ہیں اور استعداد و صلاحیت علمی کے اعتبار سے ہر آنے والی جماعت اپنی ماسبق جماعت سے کمزور ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے ایک سوال میں تعلیمی سدھار اور ساتھ ہی ساتھ جدید علوم کو نصاب تعلیم میں شامل کرنے کے سلسلہ میں بھی رائے معلوم کرنی چاہی، حضرت نے تعلیمی سدھار سے متعلق ارشاد فرمایا:

تعلیمی ماحول کا سدھار انفرادی حیثیت سے ممکن نہیں بلکہ اس سلسلہ میں موثر طریقہ کار اپنانا ناگزیر ہے۔ ملک گیر یا کم از کم صوبائی پیمانہ پر علما اور نظما سے مدارس کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس کے طے شدہ ضوابط اور نصاب تعلیم سارے اداروں میں رائج کیے جائیں۔ میں سوالات کے تقاضوں کے پیش نظر جدید علوم بالخصوص ہندی اور انگریزی کو نصاب تعلیم میں شامل کرنے کا حامی ہوں جس سے ہم موجودہ ماحول کی رفتار سے تاریکی میں نہ رہ کر حالات کا مقابلہ کرسکیں بلکہ مخالفین اسلام کے نظریات اور انداز استدلال کو سمجھ کر اور انہیں کی زبانوں میں جدید مشاہدات کی روشنی میں جواب دے سکیں۔ (جاری ہے) □□□

بقیہ: پیمائش (تبصرہ)

مترجم کا یہ اقتباس صاحب کتاب کا بھر پور اعتراف ہے۔ اور اس بات کا بھی پتہ دیتا ہے کہ مترجم نے اس سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ گرچہ اس اقتباس کے مطالعہ کے وقت قاری کی نگاہ لفظ پیرنا پر ذرا دیر کے لیے ضرور ٹھہرے گی۔ اس لیے میں قبل از وقت یہ بتادوں کہ یہ لفظ بہرحال ڈکشنری میں موجود ہے۔

انبیاے کرام کے علاوہ ائمہ سادات حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ سے حضرت امام مہدی اور صاحب کتاب سے پہلے کے تمام اہم بزرگوں کے حالات اس کتاب میں لکھے گئے ہیں۔ کتاب میں ۲۲ رنگین صفحات بھی ہیں جن میں مشاہیر انبیاے کرام اور بزرگان دین کے روضوں اور قبروں کی تصاویر ہیں اور انبیاے کرام کی آرام گاہیں جن ممالک میں ہیں ان کا جغرافیہ بھی ہے۔ جب کہ کتاب کے آغاز میں تقریظ، تقریب، تکریم اور تحریک کے عنوان سے الگ الگ بالترتیب پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب، مفتی سید شاہد علی رضوی صاحب، پروفیسر سید جمال الدین اسلم صاحب اور مولانا سید جمال احمد صاحب کی مختصر تحریریں شامل ہیں۔ ترجمہ میں کہیں کوئی کھانچہ نہیں ہے۔ حوالات و دلائل اور ضرورت کے مطابق حاشیے بھی درج ہیں۔

کتاب میں مترجم "ساحل سہرامی۔ ایک تعارف" کے نام سے چھ صفحات لیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ساحل سہرامی کی دیگر کتابوں کا تعارف بھی ہے۔ مگر پوری کتاب میں مستقل سرخی کے تحت کہیں بھی صاحب کتاب کی حیات وخدمات درج نہیں کی گئی ہیں۔ گرچہ مصنف کا تذکرہ مقدمہ میں جابجا بکھرا پڑا ہے۔ اتنی ضخیم کتاب میں مصنف کے تعارف کے لیے سرخی قائم کی جانی چاہیے تاکہ قارئین کو مصنف سے شناسائی میں آسانی ہو۔ اخیر میں مولانا سید جمال احمد صاحب (مدرسہ فیضان مصطفیٰ، زہرہ باغ، نئی آبادی، علی گڑھ) علمی حلقوں کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں، جن کی تحریک اور تعاون پر یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوکر سامنے آسکی۔ موصوف نے اگر منبع الانساب کے مخطوطہ کو حاصل کرنے اور پھر ساحل سہرامی صاحب کو اس کے ترجمے و ترتیب کی طرف توجہ نہ دلائی ہوتی تو یہ کام آسان نہ ہوتا۔

□□□

مبصر: نورین علی حق☆

نام کتاب: منبع الانساب

مؤلف: حضرت مخدوم سید معین الحق جھونسوی قدس سرہ **مترجم:** ساحل سہرامی **صفحات:** ۴۸۰، **قیمت:** ۲۰۰ روپے

سال اشاعت: ۲۰۱۰ء **ناشر:** مدرسہ فیضان المصطفے، زہرہ باغ، نئی آبادی، علی گڑھ (یوپی)

علم الانساب کے حصول کا چلن کوئی نیا نہیں ہے- اس کا رواج عربوں میں بھی تھا اسلام کی اشاعت کے ساتھ اس کا دامن بھی دراز ہوتا چلا گیا- صحابہ کرام کی دیگر ممالک کی طرف ہجرت، سانحہ کربلا اور اس کے بعد عرب کی زمین کا سادات کرام پر تنگ ہونا وغیرہ نے خاص طور پر علم الانساب کی اہمیت کو مسلم کیا- البتہ یہ علم مرور زمانہ کے ساتھ سینہ سے سفینہ کی طرف منتقل ہو گیا اور آج کم ہی خانوادے یا چند ہی افراد ہوں گے جن کے سینوں میں ان کا نسب محفوظ ہوگا- اب انساب کا سارا دار و مدار اکابر کی کھتونیوں پر منحصر ہے اور اس جدید دور میں جب کہ عملی طور پر نسب کی اہمیت تقریباً زوال پذیر ہے- ہر طرف کوششیں جاری ہیں کہ نسب کو تحریری شکل میں محفوظ کیا جائے-

یوں تو ہندوستان گیر سطح پر بہت سے خانوادے موجود ہیں جہاں ابتدا سے ہی نسب کی حفاظت کا انتظام ہے اور وہ اپنے تحفظات میں ایک حد تک کامیاب بھی ہیں- لیکن ایسے خانوادوں کی بھی کمی نہیں جن کی زنبیل شجر نسب سے خالی ہے اور انہیں اس کوتاہی کی بھاری قیمت بھی چکانی پڑ رہی ہے- لائق تحسین ہیں ہمارے علما جن کی جانکاہ محنتوں اور کاوشوں سے علم الانساب کی حفاظت ہو رہی ہے اور تمام تر مخالف جھونکوں کے باوجود علم الانساب ترقی پذیر ہے اور اس محنت سے نہ صرف فن انساب کی حفاظت ہو رہی ہے بلکہ کتنے ہی سادات خانوادے اپنی جڑوں سے پیوستہ بھی ہو رہے ہیں- خدا کرے وہ دور بھی آئے جب موجودہ سادات کرام کی اکثریت کے سروں میں اپنے اکابر کے نسب کی حفاظت کے ساتھ ان کے عمال کی حفاظت کا سودا بھی سما جائے-

فی الوقت میرے پیش نظر منبع الانساب ہے جس کے مصنف حضرت مخدوم سید معین الحق جھونسوی اپنے وقت کے کبار اولیا میں شمار کیے جاتے ہیں اور آپ کا علمی و تصنیفی قد بھی بہت بڑا ہے- منبع الانساب کا فارسی مخطوطہ تھا اور وہ اب تک اشاعت کے مرحلہ سے نہیں گزر سکا تھا، منبع الانساب کے دو مخطوطہ نسخہ کی مدد سے مولانا ساحل سہرامی نے اسے اردو قالب میں ڈھالا- جہاں ضرورت محسوس کی وہاں حاشیہ آرائی کی اور تقریباً ۷۰ صفحات پر مشتمل علمی، تحقیقی اور فکری مقدمہ کے ساتھ اسے شائع کیا- مولانا ساحل سہرامی کی اس سے پہلے بھی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور داد و تحسین کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہیں- البتہ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ مولانا کے اسلوب، انداز تحقیق اور پیش کش میں خوش آئند تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور وہ بتدریج غیر جانب دار محققین کی صف میں اپنی جگہ مختص کرنے میں بھی کامیاب نظر آ رہے ہیں- مذکورہ کتاب پر سرسری اور طائرانہ نگاہ ڈالنے پر بھی قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کے مترجم نے تحقیق، ترجمہ، حاشیہ آرائی اور تقدیم کا حق ادا کیا ہے-

چھ سو سال پرانے نسخہ کی از سر نو چھان پھٹک آسان کام نہیں ہے اور اس جوکھم بھرے عمل کو ساحل سہرامی نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام تک پہنچایا ہے- اس راہ میں انہیں دشوار گزار اور سنگلاخ وادیوں سے گزرنا پڑا ہے- جس کا اظہار انہوں نے مقدمہ میں بعض مقامات پر کیا ہے- دونوں نسخوں میں تطبیق کی راہ نکالی ہے- مصنف حضرت مخدوم سید معین الحق جھونسوی قدس سرہ کی باتوں کو دلائل و حوالات سے مزین کیا ہے- ایک جگہ رقم طراز ہیں:

"لکھنوی نسخے کی مدد سے بہت سے ناقابل قراءت مقامات کی تصحیح کی گئی، کہیں کہیں دونوں نسخے میں درج ناموں میں اختلاف تھا، انہیں oblique لکیر دے کر ساتھ ہی درج کر دیا گیا ہے- کہیں اختلافات زیادہ ہیں تو انہیں حاشیے میں واضح کر دیا ہے- غرض ہر طور سے خامیاں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے البتہ ایک کمی رہ گئی ہے وہ ہے حضرت مصنف کے اخلاف کی تفصیل اور دور حاضر تک کے جملہ اخلاف کے اجمالی شجرے کا اندراج، انشاءاللہ! آئندہ ایڈیشن میں اس کی تلافی کی بھرپور کوشش رہے گی-" (ص ۹۳)

میں نے اس اقتباس کو خاص طور پر نقل کیا ہے تا کہ مترجم و مرتب کی حق گوئی اور ان کی کوتاہی یا مواد کی عدم دستیابی کا اعتراف قارئین خود ان کی زبانی سماعت کر لیں-

☆alihaqnm@yahoo.com

منبع الانساب اپنے متعلقہ فن کے حوالہ سے ہر دور میں مصنفین و نسابین کی مرکز توجہ رہی ہے اور اس سے اپنے وقت کے برگزیدہ محققین نے استفادہ کیا ہے- یہ الگ بات ہے کہ یہ خود تو تشنہ طباعت رہی مگر بے شمار محققین و مصنفین کو اعتبار بخشتی رہی- میں سمجھتا ہوں کہ صرف منبع الانساب ہی نہیں اس پایہ کی سیکڑوں تصانیف مخطوطہ کی صورت میں اس دور کی خانقاہوں کی دیمک زدہ الماریوں میں اپنی قسمت پر ماتم کناں ہیں اور نسلیں اس انتظار میں گزرتی چلی جارہی ہیں کہ میرے بعد میرا ور خوردار اس پر کام کرے گا- یا یہ کہ ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جس سے تن تنہا استفادہ کیا جائے دوسروں کو نہ دیا جائے گرچہ الماریوں میں یہ دیمک کی خوراک بن جائیں- اس کتاب کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے مترجم ایک جگہ مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"منبع الانساب کی علمی اور تاریخی اہمیت اس بات سے خوب نمایاں ہے کہ اس کے بعد لکھی جانے والی اہم اور ماخذ کے طور پر استعمال کی جانے والی کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں- میں نے خود بحر ذخار، نزہتہ الخواطر، آئینہ اودھ اور دیگر کتابوں میں اس کے حوالے دیکھے ہیں، جب کہ یہ کتاب نہ مطبوعہ ہے، نہ اس کے قلمی نسخے عام طور سے دستیاب ہیں- اس سے ہر صاحب ذوق اس کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کا خوب اندازہ کرسکتا ہے-" (ص ٨٦)

کتاب کے مصنف حضرت سید معین الحق جھونسوی قدس سرہ کی حیات وخدمات کے اکثر گوشے پردۂ خفا میں ہیں- جیسا کہ عمومی طور پر اس دور کے بزرگان دین کا وطیرہ رہا ہے- البتہ صاحب کتاب کی حیات وخدمات کی جن جہتوں تک مترجم کی رسائی ہوسکی ہے انہیں مترجم نے پیش کیا ہے- پھر بھی صاحب کتاب کے حوالے سے گفتگو تشنگی کا احساس دلاتی ہے- مترجم نے حضرت مخدوم پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے

"حضرت سید معین الحق قادری سہروردی چشتی قدس سرہ عرفان الٰہی اور نور باطن کی رونقوں سے مالا مال تھے- حضرت نے اپنے شیخ حضرت محمد عیسیٰ چشتی جونپوری قدس سرہ کی بارگاہ میں حاضری اور حضوری کی جو روداد منبع الانساب میں بیان فرمائی ہے، اس کے اقتباسات ابھی ابھی زینت نگاہ ہوچکے ہیں- ان سے اس راہ کی معمولی شد بد رکھنے والا انسان بھی حضرت کے مراتب روحانی، قرب الٰہی، مقبولیت دربار رسالت پناہی کا اندازہ کرسکتا ہے- اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہونے کے بعد آپ جھونسی تشریف لائے اور مرشد برحق کے حکم کے مطابق خلق خدا کی ہدایت وارشاد اور بیعت روحانی کا سلسلہ شروع فرمایا- آپ اپنے اجداد کے صاحب سجادہ اور قادری سہروردی چشتی تینوں سلاسل کے مے خانوں کے ساقی تھے- حضور سرکار غوثیت ماب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات کریم سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا- آپ نے منبع الانساب میں سب سے مفصل حالات سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلم بند فرمائے ہیں، بیان کا والہانہ پن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے-" (ص ٨٣)

اس کتاب میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ حضرت مخدوم شاہ تقی الدین رحمۃ اللہ علیہ تک کا تذکرہ ہے- اس سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب کتاب کی نگاہ دنیا کی ابتدا سے اپنے زمانے تک کو محیط تھی - حالاں کہ اس دور میں آج کی طرح سہولیات بھی مہیا نہیں تھیں- اس دور میں اس پایہ کی کتاب تحریر کرنا اپنے آپ میں خود ایک بڑی جدو جہد تھی اور آج جب کہ Hard copy اور Soft copy سے لے کر لائبریریاں اور برقی لائبریریاں تک فراہم ہیں اور ان سے با آسانی استفادہ کیا جاسکتا ہے- ایسے دور میں اس طرح کی کتابیں سامنے نہیں آپارہی ہیں- مترجم کی زبانی صاحب کتاب کے سلسلہ میں ایک اور روایت ملاحظہ کریں:

"آپ کے علم وفن کے حوالے سے آنے والا مورخ تفصیل سے لکھے گا- منبع الانساب منظر عام پر آرہی ہے- احقر صرف اتنا عرض کرے گا کہ آپ کا شوق جستجو قابل داد ہے- آج سے چھ سو سال پہلے علم وفن کے حصول اور اشاعت کی راہوں میں وہ سہولتیں نہ تھیں، جواب ہیں، لیکن آپ نے دوآبے کے کنارے بیٹھ کر منبع الانساب جیسی جامع اور گلدستہ معلومات کتاب تحریر فرمائی- اس راہ میں آپ کو کتنی مشقت خیزی کرنی پڑی ہوگی، اس کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے- اس کتاب میں علم تفسیر، حدیث، اسماء الرجال، انساب، تاریخ، سوانح، تصوف، تاریخ تصوف سبھی کی جھلکیاں نظر آئیں گی- کہیں کہیں غیر رائج روایات در آئی ہیں تو انہیں وسائل کی عدم دستیابی پر محمول کیا جائے گا- سب سے بڑھ کر آپ کا جو وصف اس کتاب کی سطروں میں پیرتا ہوا محسوس ہوگا وہ آپ کی توفیق ارزانی اور بزرگوں سے والہانہ عقیدت اور ادب ہے- تصوف کا خمیر انہیں سے تیار ہوتا ہے-" (ص-٨٥) بقیہ صفحہ 58 پر ملاحظہ کریں

دینی، ملی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں

واگرا، بھڑوچ (گجرات) میں تاریخی دوروزہ محدث اعظم انٹرنیشنل کانفرنس اختتام پذیر

جانشین محدث اعظم ہند علامہ سید محمد مدنی میاں کی پچاس سالہ خدمات کو خراج پیش کرنے کے لیے ۵/لاکھ عقیدت مندوں کا ہجوم

۲۰۱۱ء میں محدث اعظم ہند علامہ سید محمد کچھوچھوی (۱۸۹۴ء/ ۱۹۶۱ء) کے وصال کو پچاس سال پورے ہوگئے- محدث اعظم ہند کچھوچھہ شریف یوپی میں آباد ہندوستان کے مشہور روحانی اور علمی خانوادے کے ایک عظیم فرد تھے، جنھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں بے شمار تحریکوں کی قیادت کی، ملک وملت کی سلامتی کے لیے روحانی ادارے، سماجی تنظیمیں اور مدارس ومساجد بنائے، بے شمار کتابیں لکھیں، رسالے جاری کیے اور پوری دنیا میں اپنی خطابت ودرس کے ذریعے معاشرے کو روحانیت، سنیت اور اسلام کی تعلیم دی- ۱۹۶۱ء میں محدث اعظم کے وصال کے بعد آپ کے صاحبزادے شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں اپنے والد کے جانشین منتخب ہوئے اور انھوں نے محدث اعظم کے روحانی اور علمی مشن کو پوری دنیا میں پھیلایا، دنیا کے مختلف ملکوں میں مدارس ومساجد قائم کیں، درجنوں کتابیں لکھیں، تنظیمیں بنائیں اور دعوت وتبلیغ کی- علامہ سید محمد مدنی میاں کی سجادگی کو پچاس سال گزر گئے، آج ان کے چاہنے والے دنیا کے مختلف ملکوں میں لاکھوں کی تعداد میں ہیں-

گجرات میں شیخ الاسلام کے عقیدت مندوں نے "محدث اعظم مشن" کے زیر اہتمام ان کی پچاس سالہ گولڈن جوبلی منانے کے لیے ۶/۵ مارچ ۲۰۱۱ء کو واگرا ضلع بھڑوچ (گجرات) میں دوروزہ "انٹرنیشنل محدث اعظم ہند کانفرنس" کا انعقاد کیا- اس کانفرنس کی سرپرستی وصدارت شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں نے کی جب کہ قیادت شیخ الاسلام کے نواسے غازی دوراں حضرت مولانا سید قاسم اشرف کچھوچھوی نے کی، انھی کے زیر نگرانی کانفرنس نے کامیابی کی نئی تاریخ رقم کی- بلا شبہ یہ کانفرنس ہندوستان کی چند تاریخی کانفرنسوں میں سے ایک تھی، جس میں تقریباً پانچ لاکھ افراد نے شرکت کی-

دس ہزار اسکوائر فٹ پر نہایت عظیم الشان اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر تقریباً ایک ہزار علما، مشائخ اور خلفائے کرام تشریف فرما تھے، جب کہ پانچ لاکھ سامعین کی نشست کے لیے پچاس ایکڑ زمین پر جلسہ گاہ کا انتظام کیا گیا تھا- کانفرنس کی کارروائی کو قریب سے دیکھنے کے لیے فیلڈ میں ۲۰/LED اسکرین نصب کی گئی تھیں، کانفرنس گاہ کے ایک طرف ۱۵۰/کھانوں کے اسٹال لگائے گئے تھے، سیکڑوں طہارت اور وضو خانے بنائے گئے تھے اور گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے پچاس ایکڑ زمین مختص کی گئی تھی جہاں کانفرنس کے کمپیوٹرائز اندراج کے مطابق تقریباً باون ہزار گاڑیاں کھڑی کی گئی تھیں- لوگوں کی حفاظت اور کنٹرول کے لیے تقریباً ایک ہزار ریاستی پولس تعینات کی گئی تھی- واگرا میں بیک وقت پانچ لاکھ لوگوں کی آمد سے دو روز تک وہاں کے موبائل فون کے تمام نیٹ ورک کام کرنا بند کردیے تھے- مگر اس کانفرنس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا انتظام وانصرام اس قدر سلیقے سے کیا گیا تھا کہ کہیں بھی کسی طرح کی بدنظمی نہیں دیکھنے میں آئی، حالانکہ جہاں لاکھوں کا اجتماع ہو وہاں لوگوں کو کنٹرول کرنا ناممکن سا ہوجاتا ہے-

کانفرنس میں شرکت کے لیے امریکہ، انگلینڈ، پاکستان اور ہندوستان کے بڑے روحانی ومذہبی علما، مشائخ اور نعت خواں تشریف لائے تھے- ان میں ہندوستان سے مولانا سید محمد ہاشمی میاں، انگلینڈ سے مولانا شاہد رضا نعیمی، پاکستان سے مولانا کوکب نورانی اکاڑوی، مولانا سید مظفر شاہ، الحاج سید صبیح الدین صبیح رحمانی، الحاج محمد اویس رضا قادری اور امریکہ سے مولانا مسعود احمد سہروردی خاص طور پر قابل ذکر ہیں- ان کے علاوہ ہندوستان سے تقریباً پچاس سے زائد علما ومشائخ اور دنیا کے مختلف حصوں سے شیخ الاسلام کے چاہنے والوں نے شرکت کی-

کانفرنس کے پہلے دن (۵/مارچ) کو خانوادے کے شہزادگان اور

علماء مولانا سید محمد ابوبکر شبلی، مولانا سید محمد نورانی، جانشین شیخ الاسلام مولانا سید محمد حسن عسکری اور غازی ملت مولانا سید محمد ہاشمی نے خطاب کیا، جب کہ نعت خوانی کے لیے خصوصی طور پر پاکستان سے تشریف لائے الحاج سید صبیح الدین صبیح رحمانی اور الحاج محمد اویس رضا قادری نے اپنے نعتیہ کلام کے ذریعے لاکھوں سامعین کو شادکام کیا- ان دونوں حضرات کو دیکھنے اور سننے کے لیے لوگوں میں ایک عجیب جوش وخروش تھا-

کانفرنس کے دوسرے دن غازی دوراں مولانا سید قاسم اشرف صاحب نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں خطبۂ استقبالیہ پیش کیا، جب کہ خصوصی طور پر مولانا شاہد رضا نعیمی (لندن) مولانا سید مظفر شاہ صاحب (پاکستان) اور مولانا کوکب نورانی اکاڑوی (پاکستان) کا خطاب ہوا- ان حضرات کے خطاب کو لوگوں نے بے حد پسند کیا- کانفرنس کے دوسرے دن بھی لوگوں کے شدید اصرار پر سید صبیح الدین صبیح رحمانی اور الحاج محمد اویس رضا قادری نے نعت ومناقب پڑھے-

اس موقع پر دہلی کا بین الاقوامی شہرت یافتہ رسالہ ماہ نامہ ''جام نور'' کا تقریباً ڈھائی سو صفحات پر خصوصی شمارہ ''محدث اعظم ہند: حیات ،افکار، کارنامے'' منظر عام پر آیا، اس خصوصی شمارے کی رسم اجراء کے لیے کانفرنس کے دوسرے دن ۶ رمارچ کو جام نور کے مدیر اعلیٰ مولانا خوشتر نورانی نے نمبر کی پہلی کاپی علامہ سید محمد مدنی میاں کو پیش کی جس کی حضرت نے رونمائی فرمائی- دونوں دن کی کانفرنس کی نظامت متین سہرامی اور مولانا خلیل اطہر اشرفی نے کی اور اس طرح اس تاریخی کانفرنس کی یاد لیے لوگ اپنے اپنے گھر کو لوٹ گئے-

البرکات اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ سینٹر کی رسم سنگ بنیاد

البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے ذمہ داروں کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز میں ایک ایسے ادارے کی داغ بیل ڈالیں جہاں عصری علوم اور دینی علوم کا حسین امتزاج ہو، جہاں مدارس اسلامیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی تعلیم وتربیت کا معیاری بندوبست ہو اور جہاں علمائے اہل سنت کی نوجوان نسل کی شخصیتوں کی تعمیر ہو- یہ ادارہ اپنے آپ میں ایک منتخب اور معیاری ادارہ ہوگا، باطنی حسن وجمال یعنی اعلیٰ تعلیم وتربیت کے انتظام کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبصورتی کا بھی حسین پیکر ہوگا، اس کی عمارت بھی دیدہ زیب ہوگی، تحقیق وریسرچ کا کام ماہر اساتذہ کی زیر نگرانی کرایا جائے گا، نصاب تعلیم دو سال کا ہوگا جو چار تعلیمی میقاتوں پر مشتمل ہوگا- ہر میقات میں جدید عربی زبان، انگریزی زبان اور کمپیوٹر کی تعلیم سمیت تقریباً پانچ مضامین مستقل کلاس میں پڑھنے ہوں گے- باقی دو یا تین اضافی موضوعات بذریعہ توسیعی خطبات پڑھائے جائیں گے- ہر طالب علم کو پہلے سال میں بزبان اردو اور دوسرے سال میں بزبان عربی/ انگریزی دو تحقیقی مقالے جمع کرنا لازمی ہوگا - اس کے لیے ایک عالی شان لائبریری ''البرکات حسن لائبریری'' استفادہ کے لیے موجود ہے، جہاں اسلامی تراث کی مرجعی کتب تقریباً مہیا ہیں- طلبہ کو خودکفیل بنانے کے لیے معیاری قیام وطعام کے ساتھ ماہانہ وظیفہ بھی اس تعلیمی پروگرام کا حصہ ہے-

الحمدللہ! ان ذمہ داروں کا حسین خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، اس مجوزہ ادارہ کی رسم سنگ بنیاد مورخہ ۱۸ر مارچ ۲۰۱۱ء بعد نماز جمعہ البرکات کیمپس کے مغربی گوشے میں بدست امین ملت پروفیسر سید محمد امین میاں قادری برکاتی زیب سجادہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ وصدر البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی ادا کی گئی- پرکیف ماحول میں حضرت امین ملت نے پہلے تمام اہل سنت کے اداروں کی بقا وسالمیت کے لیے دعا کی اس کے بعد اس مبارک ادارہ کا سنگ بنیاد رکھا-

اس موقع پر البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری عالی جناب ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی صاحب، البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز کے کوآرڈینٹر جناب ڈاکٹر فہیم عثمان صدیقی صاحب، البرکات انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اسٹڈیز کے ڈائرکٹر واساتذہ، وغیر تدریسی عملہ، البرکات انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کی ہیڈ وغیر تدریسی عملہ، البرکات پبلک اسکول کی پرنسپل، البرکات قادریہ گرلس سیکشن کی ہیڈ، البرکات پرائمری سیکشن کی ہیڈ، البرکات پلے اینڈ لرن سینٹر کی ہیڈ، نیز دونوں ہاسٹلوں کے وارڈین اور بعض طلبہ حاضر تھے-

رپورٹ:— نعمان احمد ازہری، جامعہ البرکات، انوپ شہر روڈ، علی گڑھ

ایک شام صبیح رحمانی کے نام

معروف شاعر نعت سید صبیح رحمانی کے اعزاز میں ممبئی میں محفل نعت کا انعقاد

عروس البلاد ممبئی میں ۸ر مارچ ۲۰۱۱ء کو خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے ذیلی ادارہ تاج الفحول اکیڈمی شاخ ممبئی کے زیر اہتمام معروف پاکستانی نعت گو شاعر اور نعتیہ ادب کے عالمی مجلہ نعت رنگ کے مدیر اعلیٰ سید صبیح رحمانی کے اعزاز میں ایک محفل نعت کا انعقاد کیا گیا، یہ محفل نعت

بدلا ہال، گرگام چوپاٹی میں منعقد کی گئی جس کی صدارت خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے ولی عہد ممتاز محقق و ناقد مولانا اسید الحق قادری نے فرمائی۔ مولانا خوشتر نورانی مدیر اعلیٰ ماہنامہ جام نور دہلی اور صاحبزادہ مولانا عطیف قادری بدایونی مہمان خصوصی کے طور پر شریک محفل تھے۔ محفل میں ممتاز صحافی جناب ندیم صدیقی صاحب نے فروغ نعت کے حوالے سے صبیح رحمانی کی خدمات پر مقالہ پڑھا۔ انہوں نے کہا کہ ”اردو ادب میں صنف نعت کو اس کا صحیح مقام و مرتبہ متعین کروانے کے سلسلے میں صبیح رحمانی نے سیدانہ کردار ادا کیا ہے“۔ مولانا خوشتر نورانی نے صبیح رحمانی کی نعتیہ خدمات کا تفصیلی تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ ”نعت پر تحقیق و تنقید کے سلسلے میں اردو ادب میں صبیح رحمانی نے تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے“۔ مولانا اسید الحق قادری نے اپنے صدارتی خطاب میں نعت کے آغاز و ارتقا، اس کی شرعی اور ادبی حیثیت پر روشنی ڈالی، ساتھ ہی آپ نے نعت کے فروغ و ارتقا کے سلسلے میں خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کی خدمات کا بھی ذکر فرمایا۔ انہوں نے فروغ نعت کے سلسلہ میں نعت رنگ اور صبیح رحمانی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ”صبیح رحمانی کی یہ ایسی خدمات ہیں جو انہیں دنیا اور آخرت دونوں جگہ سرخ رو کرنے والی ہیں“۔ خانقاہ قادریہ کی جانب سے صبیح رحمانی کی خدمت میں ”اعتراف خدمات“ کے طور پر مولانا عطیف قادری اور الحاج حافظ عبدالقیوم قادری منتظم خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے ہاتھوں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ آخر میں سید صبیح رحمانی نے اپنے تاثرات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ ”خانقاہ قادریہ کی جانب سے مجھے دیا جانے والا یہ اعزاز میرے لیے کسی بڑے سے بڑے ایوارڈ سے بھی زیادہ اہم ہے“۔ انہوں نے خانقاہ قادریہ کے صاحب سجادہ حضرت شیخ عبدالحمید سالم میاں قادری صاحب سے اپنی عقیدت و محبت اور ان کی شفقتوں کا ذکر فرمایا اور اس اعزاز پر اراکین خانقاہ کا شکریہ ادا کیا، پھر انہوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے اور پر سوز ترنم میں نعت رسول کا نغمہ بلند کیا اور سامعین پر ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ آخر میں تاج الفحول اکیڈمی شاخ ممبئی کے سکریٹری الحاج انیس پٹیل قادری نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ محفل میں ممبئی کی اہم علمی اور ادبی شخصیات کے علاوہ کثیر تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔

رپورٹ:— محمد یعقوب قادری ناگوری، تاج الفحول اکیڈمی شاخ ممبئی

بدایوں شریف میں عظیم شانتی سمیلن

محسن انسانیت سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پہلے دنیا کو انسانیت کا جو پیغام دیا، اس کی اہمیت اور معنویت آج بھی قائم ہے اور تا قیامت رہے گی۔ آج کے اس پر آشوب دور میں اگر ایک بار پھر دنیا پیغمبر اسلام کے بتائے ہوئے راستے کو اپنا لے تو یقیناً دنیا میں امن و آشتی کا بول بالا ہوگا اور سارے جہان سے مسائل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان خیالات کا اظہار سرزمین بدایوں میں منعقد عظیم الشان تاریخی امن کانفرنس (شانتی سمیلن) میں مقررین نے کیا۔ یہ امن کانفرنس عید میلاد النبی کی مناسبت سے برصغیر ہند و پاک کی قدیم تاریخی خانقاہ، خانقاہ قادریہ بدایوں کے زیر اہتمام ۱۳ر فروری ۲۰۱۱ء کو بدایوں کے اسلامیہ انٹر کالج کی وسیع و عریض فیلڈ میں منعقد کی گئی، جس کی صدارت و سرپرستی تاجدار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری بدایونی، صاحب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں نے فرمائی۔ اس سمیلن کی انفرادیت یہ رہی کہ اس میں تمام مذاہب کے علما و دانشور حضرات نے شرکت کی اور محسن انسانیت کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے ولی عہد عالم ربانی مولانا اسید الحق قادری نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ ”اسلام ایک امن پسند مذہب ہے، جو دنیا میں امن و امان کے قیام کے لیے آیا ہے، اسلام دوسروں سے محبت کرنا سکھاتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت ہمیں امن و آشتی کا پیغام دیتی ہے، دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام پہنچانا امت اسلامیہ کا اولین فریضہ ہے اور اس پیغام کو عام کرنے کا موقع عید میلاد النبی سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا، اسی لیے اس موقع پر یہ کانفرنس منعقد کی گئی ہے“ انہوں نے مزید کہا کہ ”ہندستان میں خانقاہوں نے ہر دور میں امن و امان کے قیام اور خدمت خلق کے ذریعے اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ہے، خانقاہ قادریہ بدایوں شریف بھی اسی خانقاہی روایت کی علمبردار ہے“۔ عظیم مفکر و دانشور پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ”ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں یہ بابرکت اور مقدس مہینہ عطا فرمایا۔ شانتی سمیلن کے ذریعہ جو پہل کی گئی ہے یہ موجودہ دور میں اسلام کی بہترین خدمت ہے۔ اسلام کا اصل پیغام امن و شانتی قائم کرنا ہے۔ آج جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کر رہے ہیں، انہی لوگوں نے کچھ طاقتوں کو افغانستان میں تیار کیا۔ دراصل دہشت گردی کی وبا کو جنم دینے والی یہی طاقتیں ہیں“۔ معروف

سماجی کارکن اور مفکر سوامی اگنیویش جی نے اپنی تقریر کا آغاز جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا تو ہزاروں کی تعداد میں موجود حاضرین نے گرم جوشی سے نعرے لگا کر ان کا استقبال کیا-سوامی اگنیویش نے جہاں پیغمبر اسلام کی تعلیمات پر روشنی ڈالی، وہیں ملک اور دنیا کو درپیش مسائل کے خاتمے کی پر زور اپیل کی-اس سے قبل شانتی سمیلن کا آغاز خطیب اہل سنت مولانا عطیف میاں قادری کے خصوصی خطاب سے ہوا-انہوں نے کہا کہ ”ہم سب اپنے کردار کے ذریعے رسول کریم کے پیغام کو عام کریں اور ملک ودنیا میں اتحاد و یکجہتی کے امین بنیں-“ تاجدار اہل سنت حضرت شیخ سالم قادری بدایونی، صاحب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں محسن انسانیت کی سیرت طیبہ اور اسلام کی امن پسند تعلیمات پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلام کا نام لے کر کی جانے والی ہر قسم کی دہشت گردی اور تخریب کاری کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ”اسلام امن وامان کا مذہب ہے اسلام کے نام پر دہشت پھیلا کر لوگ اسلام کو بدنام کر رہے ہیں-“

شانتی سمیلن میں معروف عالم دین اور قلم کار مولانا یٰسین اختر مصباحی، فادر ایم ڈی تھامس (ڈائرکٹر کمیشن فار ریلیجیس ہارمونی نئی دہلی) ڈاکٹر خواجہ اکرام (ایسوسی ایٹ پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی) بھگوت آچاریہ پنڈت انل شاستری (ورنداون متھرا) اور سکھ مذہبی رہنما سردار گرمیت سنگھ نے بھی شرکت کی اور خطاب کیا- مولانا خوشتر نورانی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے تمام مہمانان خصوصی اور جملہ حاضرین کا استقبال کیا، اس کے علاوہ مشہور و مقبول شاعر پدم شری جناب بیکل اتساہی نے بارگاہ رسالت میں منظوم خراج عقیدت پیش کیا، سمیلن کی نظامت ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن رامپوری نے کی- اس سمیلن میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کے علاوہ بڑی تعداد میں غیر مسلم برادران وطن نے بھی شرکت کی، شرکا کو ہندی اور انگلش میں اسلام کے تعارف اور سیرت طیبہ پر مشتمل پانچ کتابوں کا سیٹ پیش کیا گیا-

رپورٹ:—— تنویر قادری، میڈیا سکریٹری تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں

الٰہ آباد میں جشن یوم غزالی کا انعقاد اور مجلہ الاحسان کی رونمائی

۲۷/مارچ ۲۰۱۱ء بروز اتوار، خانقاہ عارفیہ (جامعہ عارفیہ) سید سراواں الٰہ آباد میں داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کی سرپرستی میں جشن یوم غزالی کا انعقاد ہوا- اس میں خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر سید شمیم الدین احمد منعمی خانقاہ منعمیہ پٹنہ بہار، رئیس التحریر حضرت مولانا یٰسین اختر مصباحی دار القلم دہلی، مفتی بدر عالم مصباحی استاذ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اور نبیرۂ حافظ ملت حضرت مولانا نعیم الدین احمد مصباحی شریک ہوئے- ان کے علاوہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور، ضیاء العلوم خیر آباد اور محمد آباد گوہنہ کے مختلف اساتذہ اور علمائے کرام اس جشن میں شریک ہوکر بزرگوں کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہوئے- ان میں مفتی ظہیر حسن، مولانا عارف اللہ فیضی، مولانا نذیر احمد منانی، مولانا نصر اللہ رضوی اور مولانا امجد علی کے نام قابل ذکر ہیں-

۲۶/۲۵/۲۴ مارچ کو طلبہ جامعہ عارفیہ نے مختلف مسابقتی پروگرام کا انعقاد کیا اور مقابلہ میں اول، دوم، سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات سے نوازا گیا- ان کے علاوہ ان طلبہ کو بھی انعامات سے نوازا گیا جنہوں نے اپنی اپنی جماعت میں جامعہ کے سالانہ امتحان میں اول درجہ حاصل کیا تھا-

۲۷/مارچ بروز اتوار بعد نماز عشا جلسے کا آغاز تلاوت کلام اللہ سے ہوا، اس کے بعد حمد باری تعالیٰ اور نعت ومنقبت کے اشعار پڑھے گئے- ڈاکٹر سید شمیم الدین احمد منعمی نے تصوف اور صوفیہ کے تعلق سے بڑا ہی پر مغز اور پر کیف خطاب فرمایا- انہوں نے چند اصطلاحات تصوف کی توضیح کی اور کہا کہ صوفیہ کی اصطلاح میں مرد اس کو کہا جاتا ہے جو خواہشات نفسانی سے پاک اور آزاد ہو-

مولانا یٰسین اختر مصباحی نے تصوف وعلم کو جمع کرنے کی دعوت دی اور خانقاہ عارفیہ سید سراواں کے بارے میں کہا کہ ”قدیم مشائخ کے حالات اور خانقاہی نظام کے بارے میں جو کچھ کتابوں میں پڑھا کرتے تھے الحمد للہ! اس کی رنگت اور جھلک یہاں آنکھوں سے دیکھنے کو ملتی ہے-“ اس کے بعد تصوف پر علمی تحقیقی اور دعوتی مجلہ ”الاحسان“ کے دوسرے شمارے کی رونمائی ہوئی- نعت خوانی، حمد پاک اور تقاریر کے درمیان لوگ آہ وبکا اور گریہ وزاری کرتے نظر آئے- صاحب سجادہ داعی اسلام حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کی دعاؤں پر اس مبارک جشن کا ۱۲:۱۵ بجے اختتام ہوا- تھوڑے سے وقفے کے بعد قدیم بزرگوں اور مشائخ کی طرز پر سماع کی محفل منعقد ہوئی جو فجر تک چلتی رہی- تمام حاضرین محفل نے فجر کی نماز باجماعت ادا کی، نماز کے بعد فاتحہ ہوئی، حاضرین نے لنگر تناول کیا اور عمل کے جذبے سے سرشار ہوکر اپنے گھروں کو لوٹے-

Registered with the Registrar of Newspapers for India No. DELURD/2002/8231 DL(DG)-11/8049/09-11
MILLAT KA TARJAMAN JAAM-E-NOOR, Monthly
422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-110006
Vol.: 9 Issue: 102 May 2011

Printed Published & Owned by Ghulam Rabbani, Printed at : Star Offset Printing Press, 2229/A, Ahata Hajjan Bi, Rodgaran, Lal Kuan, Delhi-6 & Published at 422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6
Editor : Khushtar Noorani